حالات

مولانا ابوالکلام آزاد

اس کتاب میں امام الہند مولانا آزاد کے مفصل حالات،
"الہلال" کے مفید مضامین، مختصر مقدمہ کراچی، خطبہ صدارت
شامل ہیں

(مؤلفہ)
محمد عظمت اللہ ملیح آبادی

تعداد ایک ہزار
قیمت عمر

(مطبوعہ انصاری پریس دہلی)

انتساب

میں حسنِ عقیدت کے اس گلدستہ کو کلکتہ اور دہلی کے
مشہور قوم پرور تاجر خان بہادر محمد جان صدر
استقبالیہ آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کے نامِ نامی سے
منسوب کرتا ہوں جو اس قائد ملک وملت کا شیدائی ہے
جس کی یہ سوانح حیات ہے

محمد عظمت اللہ

۲۷/اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

ابتدا

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی علمی بلندی، سیاسی بصیرت اور اخلاق کی پاکیزگی، ان کا عزم وارادہ، ثبات واستقلال دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ مولانا نے ۱۹۲۰ء میں دنیا کی سیاست کے متعلق جو رائے قائم کی تھی اب تک نہ بدلی حالانکہ آپ کے رفیق کارواں منزل کے ہر موڑ پر بدلتے رہے۔ عزم وارادہ کے اس استقلال میں ہندوستان کا کوئی رہنما آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ قدموں کے ڈگمگانے اور خیالات کو بدلنے کے ایک نہیں سیکڑوں طوفان آئے مگر مولانا اپنے ارادہ اور پروگرام پر پہاڑ کی طرح قائم رہے۔

ہندوستان کی آزادی کے لئے کانگریس کی حمایت اور مذہبی حقوق کے تحفظ کے لئے جمعیۃ علماء کی رفاقت مولانا کا دائمی وظیفہ رہا ہے، سنجیدگی ومتانت، خودداری وبے نیازی جو انسانیت کے گراں مایہ محاسن ہیں مولانا میں بدرجہ کمال ہیں، قرآن کی اشاعت، دعوۃ وتبلیغ مولانا کا ابتدا ہی سے طریق کار رہا ہے، دنیائے اسلام کو اغیار کے حملوں سے محفوظ رکھنے ہندوستان کو اجنبی اقتدار سے نکالنے کی سعی مولانا کی زندگی کے مشاغل ہیں۔ پیش نظر اوراق میں مولانا کی انہی حالات زندگی کو لکھا گیا ہے۔

ہندوستان کے ایک مشہور قانون داں نے مولانا کی مختصر سوانح عمری لکھی ہے جس میں لکھا ہے کہ

مولانا عرصہ تک اسلامی تعلیم کے منکر رہے اور بعد میں گہرے مطالعہ کے بعد اسلامی تعلیم کے قائل ہوگئے:۔

مولانا کی مذہبی زندگی پر یہ ایک بہت بڑا الزام ہے، یہ کتاب اسلئے لکھی گئی ہے کہ حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ اس غلط پروپیگنڈہ سے بچ جائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا ابوالکلام آزاد

نام و نسب تاریخی نام فیروز بخت محی الدین اصلی نام احمد ابوکلام۔ کنیت، آزاد، لقب، والد کا نام مولانا خیر الدین والدہ مدینہ منورہ کے مفتی شیخ محمد بن ظاہر کی بھانجی تھیں جو عربی علم ادب اور اسلامی علوم کی بڑی عالمہ تھیں، آبائی وطن دہلی ہے۔

پیدائش ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جو ہندوستانیوں نے غیر ملکی تسلط و اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے لڑی تھی اس لڑائی میں بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانی شریک تھے، ہندوستان کے بہادر سپاہیوں اور مجاہدوں کا صرف ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت نہ ہو اسی جذبہ کو لے کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں براہ راست انگریزوں سے آزادی وطن کے لئے لڑائیاں ہوئیں مگر ہندوستانی کسی ایک لڑائی میں بھی کامیاب نہ ہو سکے ناکامی کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستانی لڑنے والوں میں صرف جذبہ تھا تنظیم نہ تھی اور بعض وطن دشمن برسر اقتدار ہندوستانی انگریزوں کے حامی اور دوست بن گئے

انگریزوں نے ہندوستانیوں پر غلبہ پاکر اس طرح اپنے جوشِ غضب اور جذبۂ انتقام کی تکمیل کی کہ توپوں بندوقوں اور تلواروں کے استعمال کے بعد پھانسی کے تختوں پر لٹکاکر تڑپنے کے نظارہ سے آنکھوں کو ٹھنڈا کیا، جلاوطنی اور قید و بند کے مصائب میں مبتلا کر کے برسوں تک ہزاروں انسانوں کے ارمانوں کا خون کیا۔ یہی وقت تھا کہ ہندوستان ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ آزادی، عزت، حکومت، دولت تو چھن چکی تھی مگر انسانوں کے قتل نے تو زندوں کو زندہ در گور کر دیا تھا، ہر طرف سے بیواؤں، یتیموں اور لاوارثوں کے نالہ و بکا کی آوازیں آرہی تھیں جس سے سننے والوں کے دل پہلے جاتے تھے، زخمیوں اور بیماروں کے کراہنے اور تڑپنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں مگر کوئی نہیں تھا جو ان مصیبت کے مارے غمزدوں کا غمگسار اور تیماردار ہوتا۔

اسی جنگ آزادی میں مولانا خیر الدینؒ بھی شریک تھے، جنگ کی ناکامی کے بعد آپ ملک کی تباہی و بربادی سے دل برداشتہ ہو کر ہندوستان کے باہر کے ملکوں کا دورہ کرنے کے لئے چلے گئے، مصر، ترکی اور عراق کا دورہ کرتے ہوئے آپ حجاز پہنچے، ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ عرب کے تاریخی شہر مکہ معظمہ میں مولانا پیدا ہوئے۔

خاندان آپ کے خاندان میں صدیوں سے علم کا سلسلہ جاری تھا، خاندان میں متعدد مشہور علماء و مشائخ گذرے، اکبر اعظم کے دور سلطنت کے زمانہ میں شیخ محمدؒ زبردست عالم اور صوفی گذرے ہیں شاہ جہاں بادشاہ کو

حضرت شیخ محمدؒ سے شرف بیعت حاصل تھا، مولانا کے نانا مولانا منورالدینؒ صاحب۔
اس زمانہ میں جبکہ مغلوں کی شاہنشاہیت کا چراغ گل ہو رہا تھا شاہ عالم اور اکبر ثانی کے عہد میں وزیر تعلیمات تھے اُن کے نانا کے والد مولانا رشیدالدینؒ مغلوں کے عہد میں لاہور کے قاضی اعظم تھے اور احمد شاہ ابدالی کی طرف سے پنجاب میں جو صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا آپ اس کے مشیر بھی تھے۔ ان کے دادا مولانا ہادیؒ صاحب دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کے کھنڈرات اب بھی حوادث و انقلاب کی تند و تیز آندھیوں کے تھپیڑوں کے لئے چتلی قبر دہلی میں موجود ہیں۔ مولانا خیرالدین صاحب اپنے زمانے کے سرکردہ مذہبی علماء میں سے تھے، عربی زبان میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو مصر میں چھپکر شائع ہوئیں، آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بمبئی، کلکتہ کاٹھیاواڑ کے علاوہ غیر ممالک مصر، شام، عراق جاوا اور لنکا وغیرہ میں آباد تھی۔

تعلیم

آپ کی تعلیم کا آغاز مذہبی تعلیم سے ہوا ایک مولوی صاحب کو مقرر کیا گیا جو آپ کو دینی تعلیم دینے لگے آپ بہت ذہین تھے جو کچھ پڑھتے یاد ہو جاتا، تھوڑے ہی دنوں میں آپ نے اردو فارسی اور عربی میں اچھی تعلیمی قابلیت حاصل کرلی۔ تعلیم کا شوق روز بروز بڑھتا گیا اور اب درسی کتابوں سے فراغت کے بعد اسلامی لٹریچر اور تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا، قرآن شریف کے پڑھنے میں بہت زیادہ غور و فکر کرتے اور بار بار پڑھتے۔ قوت حافظہ اور فہم نے قرآن کے حفظ ہونے اور تفاسیر کے سمجھنے

میں بہت مدد کی آپ پندرہ سال کی عمر میں عالم اور حافظ قرآن ہو گئے۔

قاہرہ اور جامعہ ازہر کی تعلیم، مصر، عراق، شام اور ترکی کی سیر و سیاح
آزاد ممالک کے علما کی صحبت میں رہنے سہنے اور علمی مسائل پر گفتگو کرنے
آپ کے خیالات میں ایک عظیم الشان انقلاب ہوا، علامہ ابن تیمیہؒ اور
ابن قیم کی تصانیف کے مطالعہ نے آپ کو قرآن اور حدیث کے مسائل
میں بڑی مدد دی۔

انگریزی تعلیم

لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دینے
جو طریقہ اختیار کیا تھا اس پر سرکاری تعلیمی اداروں میں
شروع ہو گیا تھا، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی کی
اُن کو اپنے مذہب اور وطن سے بیگانہ کر دیا جائے جذبہ حُریّت اور احس
خودداری مٹا دیا جائے اور اس قابل بنا دیا جائے کہ انگریزی پڑھ کر لوگ
تمام فطری صلاحیتیں کھو کر حکومت کے محکموں میں نوکریاں تلاش کرتے
جو نام کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں اور کام کے اعتبار سے انگ
ہوں، انہی حالات کو دیکھ کر ابتدا میں مسلمانوں نے انگریزی تعلیمی ادارو
شک وشبہہ کی نظروں سے دیکھا۔

ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی انگریزوں کا مق
مسلمانوں سے تھا اس لئے انگریزوں نے مسلمانوں کے مٹانے کے
[illegible] کوشش کی، ان کی جنگ مسلمانوں کی حکومت سے ہی نہیں تھی، ملکا

بھی تھی۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف غلط اور ناجائز پروپیگنڈا کر کے چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور دنیا میں بسنے والی دوسری قوموں کو اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی سے روک دیں۔ انگریزی زبان میں مذہب اسلام کے خلاف اتنا گندہ لٹریچر شائع کیا کہ وہ انگریزی پڑھے لکھے لوگ جو انگریزوں کے علاوہ کسی کو دیانتدار اور سچا نہیں سمجھتے، اپنے مذہب سے بیزار اور نکتہ چیں ہو گئے۔ اس دور الحاد اور بیدینی کو دیکھ کر مولانا نے یوروپین لٹریچر کی طرف توجہ کی اور اتنی انگریزی تعلیم حاصل کر لی کہ آسانی کے ساتھ انگریزی لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگے۔

انقلابی زندگی کا آغاز

سیاسی زندگی میں تاریخی واقعات اور ۱۸۵۷ء کے حالات نے آپ کی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا ایک طرف ہندوستانیوں میں جمود اور سرکار پرستی کا جذبہ تھا تو دوسری طرف حکومت ہندوستانیوں کے جذبۂ آزادی کو مٹانے کے لئے مصروف تھی اس کشمکش میں جبکہ عام طور پر بزدلی اور بیجا وفاداری کے جذبہ نے لوگوں کے دل و دماغ کو معطل کر دیا تھا مولانا نے اس غلامانہ ذہنیت اور ذلیل زندگی کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے ہندوستان کے اخباروں نے ان مضامین کی اشاعت میں کافی حصہ لیا۔ آپ کے مخصوص طرزِ تحریر نے بہت جلد پڑھنے والوں کے دلوں میں گھر کر لیا ۱۹۰۸ء میں جب کہ

آپ نے اپنی عمر کی صرف سترہ بہاریں دیکھی تھیں او ستر کے مشہور اخبار وکیل کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

مسلم لیگ کا قیام

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اس وقت ہندوستان کی سیاست اپنے پہلے دور سے گذر رہی تھی لوگوں پر سامراج کی وحشت چھائی ہوئی تھی مسلمان ہندوستان کی سیاسی زندگی سے تقریباً الگ تھے عام طور پر مسلمانوں کے لیڈر مسلمانوں کو یہی تعلیم دیتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہولہے اس لئے انھیں چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیئے انگریزوں کا ساتھ دیں اور سیاسی تحریکوں سے الگ رہ کر حکومت کے وفاداروں کی فہرست میں شامل ہو جائیں مولانا نے اس غلط تحریک کا رُخ بدلنے اور مسلمانوں کے پامال اور مُردہ جذبات کو زندہ کرنے کے لئے مقابلہ پر آ گئے اور چھ سال سے اس تحریک کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے۔

الہلال

اپنے خیالات اور ارادوں کی اشاعت کے لئے ایک مستقل ہفتہ وار اخبار کی ضرورت پیدا ہوئی تو آپ نے ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار "الہلال" شائع کرنا شروع کیا، مسلمانوں کو ہندوستان کی سیاسی تحریک سے الگ رکھنے کے لئے جو سیاسی پروپگنڈا کیا جا رہا تھا اس کی زبردست مخالفت کرنا شروع کردی اور اس کے مقابلے میں یہ تحریک شروع کی کہ غیر ملکی تسلط کے ہاتھوں میں ان کے مفاد محفوظ نہیں ہیں مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے

کہ وہ بحیثیت ہندوستانی آپس میں مل کر ہندستان کو غیر ملکی اقتدار سے چھڑالیں۔

مولانا کے طرز تحریر نے ملک میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اخبار "الہلال" اردو کے مشہور اخباروں میں شمار ہونے لگا اور عام طور پر مولانا کے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھے جانے لگے ملک کے آزاد خیال اور قوم پرور مسلمان آپ کی طرف جھک گئے اور جو باتیں سرکاری خیر خواہوں نے مسلمانوں کو سمجھا رکھی تھیں ان کا اثر زائل ہونا شروع ہوگیا اب ملک میں دو قسم کے گروہ بن گئے آزاد خیال اور حکومت پرستوں کا، حکومت پرست طبقہ جس میں مسلم لیگ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی بھی شریک تھے اُن کو مولانا کی حب الوطنی اور آزاد خیالی کی تبلیغ پسند نہ آئی اور اُنھوں نے اُس کی مخالفت کرنی شروع کردی مولانا نے ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور اپنی جگہ پہاڑ کی طرح قائم رہے، سمجھدار اور معقولیت پسند مسلمانوں کی ایک جماعت مولانا کی ہمخیال بن کر میدان سیاست میں آگئی اور اس نے سیاسی تحریک کو خود غرضی، اعزاز اور نوکریوں کے حدود سے نکال کر آزادی ہند کی طرف مائل کردیا، اس بڑھتی ہوئی رو کے خیالات اور اثرات سے مجبور ہوکر مسلم لیگ نے اپنا نصب العین "ذمہ وار حکومت" قرار دیا۔

جنگِ عظیم

۱۹۱۴ء میں مسلمانوں میں ہندوستان کی سیاسی تحریک کے متعلق ایک کشمکش ہورہی تھی کہ یورپ پر جنگ کی کالی گھٹائیں چھا گئیں جس سے یورپ کا مستقبل بالکل تاریک ہوگیا۔ برطانیہ اس جنگ میں شریک تھا

اس لئے ہندوستان کو بھی اس جنگ میں شریک سمجھ لیا گیا، ہندوستان کے آزاد خیال طبقہ نے یورپ کی اس جنگ کو ہندوستان کی آزادی کے حاصل کرنے کے لئے غنیمت جانا مولانا نے "الہلال" میں پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا، حکومت نے اخبار کی اس آزاد نگاری کو پسند نہ کیا اور اس نے اخباروں کے مضامین اور خبروں کی جانچ کے لئے "سنسر" کا محکمہ قائم کر دیا، مولانا نے حکومت کے طرز عمل پر نکتہ چینی بدستور جاری رکھی۔ اخبار "پائنیر" جو ان دنوں الہ آباد سے شائع ہوتا تھا مولانا آزاد کی تحریروں سے چیخ اٹھا اور اس نے اپنے ایک مقالہ میں حکومت کی توجہ "الہلال" کی طرف مبذول کرائی "الہلال" کے مضامین نے ہندوستان کے سرکاری ایوانوں ہی میں نہیں بلکہ ملک معظم کی حکومت کے ایوانوں میں بھی تہلکہ مچا دیا۔ اور دارالعوام میں اس کے متعلق سوالات دریافت کئے گئے۔

"الہلال" کی پہلی ضمانت ضبط کر لی گئی اور دس ہزار روپئے کی نئی ضمانت مانگ لی گئی مولانا نے ضمانت داخل کرنے پر اخبار بند کرنے کو ترجیح دی "الہلال" کی خدمات اب اتنی ہمہ گیر ہو گئی تھیں کہ وہ عوام کا ہر دلعزیز اور محبوب اخبار بن گیا تھا۔ اس اخبار کے بند ہونے پر مولانا شوکت علیؒ نے فرمایا تھا کہ "الہلال" نے ہمیں آزادی کا سچا راستہ دکھایا ہے۔

نظر بندی

"الہلال" کے بند ہو جانے کے بعد مولانا نے "البلاغ" جاری کیا اور جو کام "الہلال" سے لیا جاتا تھا وہی کام "البلاغ" سے

لیا جانے لگا۔ حکومت اس اخبار کو بھی برداشت نہ کر سکی، مولانا پر ان کی حق گوئی اور صاف نگاری کی وجہ سے ڈیفینس آف انڈیا کی دفعہ ۳ کے ماتحت ایک حکم کی تعمیل کرائی گئی کہ آپ یوپی، دہلی، پنجاب، سی پی اور بمبئی وغیرہ صوبوں میں نہیں جا سکتے۔ اس وقت صرف بنگال اور بہار میں آپ کا داخلہ کھلا ہوا تھا لیکن ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو بنگال کی حکومت نے بھی آپ پر ایک حکم امتناعی کی تعمیل کرائی کہ آپ ایک ہفتہ کے اندر بنگال چھوڑ دیں اس حکم کے کے بعد آپ ۳۰ مارچ کو رانچی چلے گئے اور چار ہفتہ کے بعد حکومت ہند نے آپ کو رانچی میں نظر بند کر دیا۔ اور شہر سے باہر "مورا بادی" نامی گاؤں میں تنہا مکان میں رکھا گیا۔

مولانا کی نظر بندی کی خبر سے ہندوستان میں ایک زبردست تہلکہ مچ گیا اور آپ پر سے پابندی اٹھوانے کے لئے زبردست ایجی ٹیشن کیا گیا، تقریباً سات ہزار سرکردہ اصحاب کے دستخطوں سے لارڈ کارمیکل کے دربار میں ایک درخواست دی گئی کہ مولانا آزاد کو رہا کیا جائے لیکن حکومت مولانا کی تحریر و تقریر سے اس درجہ خائف تھی کہ اس نے مولانا کو رہا کرنا گوارا نہ کیا، جب کونسل میں مسٹر مظہرالحق نے آپ کی نظر بندی کے متعلق سوالات کئے اور آپ کی نظر بندی کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو حکومت کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ مولانا آزاد کا بنگال کی انقلاب پسند جماعتوں سے تعلق ہے۔

مولانا نے تحریک آزادی وطن کا جو جذبہ ہندوستان کے کروڑوں

انسانوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا وہ نظر بندی کے بعد ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا عوام اور خاص کر مسلمان حب الوطنی کے جوش میں آکر "سامراجی" طاقت سے پُرامن جنگ کے لیئے تیار ہو گئے۔

۱۹۱۸ء میں جبکہ یورپ کی جنگ آخری منزلوں سے گذر رہی تھی تو اس وقت عام مسلمان نشۂ آزادی میں سرشار نظر آتے تھے چار سال تک مولانا رانچی میں نظر بند رہے اور جنوری ۱۹۲۰ء میں جب یورپ کی جنگ ختم ہو گئی تب مولانا کو رہا کیا گیا۔

تحریکِ خلافت

ترکی حکومت جب جرمنوں کی طرف سے اتحادیوں کے خلاف جنگِ عظیم میں شریک ہو گئی اُس وقت لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ

ہم اس لیئے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالحکومت سے محروم کر دیں ان وعدوں کے ساتھ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی فوج میں بھرتی کی گئی۔ ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو شکست ہو گئی اور سلطنتِ ترکی کو اتحادیوں نے تقسیم کر لیا اس سے دنیائے اسلام میں ہلچل ہو گئی اور اس کے اثرات ہندوستان میں بھی پہنچے اور جگہ جگہ مسلمانوں کے جلسے ہونے لگے۔

ترک موالات میں ہندوؤں کی شرکت

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام آزاد رانچی کی نظر بندی سے رہا ہو کر خلافت کے جلسوں میں شریک ہوئے اور پراونشل کانفرنس کے جلسہ کی جو ۲۹ر فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں ہوا صدارت

فرمائی اور ترک موالات کا شرعی پروگرام سب سے پہلی بار مولانے پیش کیا اس تجویز نے ہندوؤں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ایک سب کمیٹی میں مولانا نے اپنا ترک موالات کا پروگرام اور گاندھی جی نے نان کوآپریشن کا پروگرام پیش کیا حسنِ اتفاق سے دونوں ایک تھے

ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ

۱۹۲۰ء میں ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی جو امرت سر کے جلیانوالہ باغ میں عوام الناس کے پرُامن اور نہتے مجمع پر گولیاں برسانے کی تحقیقات کے بارہ میں تھی۔ یہ رپورٹ چونکہ ہندوستانیوں کے خلاف تھی اس لئے اِس سے تمام ملک میں برہمی پیدا ہوگئی آخر کار ۳۰ رمئی ۱۹۲۰ء کو بنارس میں کانگریس کمیٹی نے طے کر دیا کہ حکومت سے ترکِ موالات کیجائے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد یکم و ۲ ر جون ۱۹۲۰ء کو ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان مشترک جلسہ الہ آباد میں ہوا جس میں ترکِ موالات کو باقاعدہ منظور کیا گیا اور حسبِ ذیل حضرات مقرر کئے گئے کہ وہ ملک میں تحریک ترک موالات کو پھیلائیں۔

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد (۲) گاندھی جی (۳) مولانا محمد علی مولانا شوکت علی (۴) ڈاکٹر کچلو (۵) مولانا حسرت (۶) حاجی احمد صدیق کھتری۔

۱۹۲۱ء میں خلافت کی تحریک نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کا جو عظیم الشان مظاہرہ کیا اس نے حکومت پرستوں کے دلوں میں ناسور ڈالدیئے

مولانا کی گرفتاری

۱۹۲۱ء پرنس آف ویلز ہندوستان آئے ملک میں

تحریک زوروں پر تھی کانگریس اور دیگر قوم پرست جماعتوں نے پرنس آف ویلز کے استقبال کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا، حکومتِ بنگال نے اس بائیکاٹ کو ناکام بنانے کے لئے سخت گیریوں اور تشدد کا پوری طرح استعمال کیا کانگریس کمیٹیوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ میں مولانا کو گرفتار کر کے ایک سال قید کی سزا دی گئی۔

۲۴ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو کان پور میں مولانا نے خلافت کانفرنس کی صدارت کی اس کانفرنس میں گاندھی جی بھی شریک تھے۔

۲۸ر فروری ۱۹۲۰ء کو پروونشل خلافت کانفرنس کی صدارت کی اور مسئلہ خلافت اور جزیرہ کے نام سے ایک بہترین خطبہ دیا جو اب تک تاریخی اور علمی یادگار رہے۔ آگرہ میں بھی آپ نے خلافت کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

جمعیۃ علما ہند جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس ۱۹ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند کی صدارت میں دہلی میں ہوا جس میں پانسو علما شریک تھے مولانا آزاد بھی جیل سے رہا ہو کر اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے ہندستان کے مشہور علما رہنما بھی اس جلسہ میں شریک تھے اس میں حکومت سے ترک موالات کر کے خطابات عہدے، امپری کونسل، ملازمت فوج چھوڑنے کے متعلق تجاویز پاس کی گئیں اس سلسلہ میں پانسو علماء کا متحلی فتوے ترک موالات کی نسبت شائع کیا گیا جو حکومت نے ضبط کیا تھا اور اس ضبطی کے خلاف سول نافرمانی کی گئی تھی۔

جمعیۃ علماء ہند کا تیسرا اجلاس ۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء کو لاہور میں مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا اس میں ولائتی کپڑے کا مقاطعہ قرار پایا اور علما کے فتوے کی ضبطی پر جس میں فوج اور پولیس کی ملازمت ممنوع کی گئی تھی حکومت سے ناراضی کا اظہار کیا گیا اور قرار پایا کہ فتوے کو دہرایا جائے اور مسلمانوں کو فوج اور پولیس کی نوکریوں سے منع کیا جائے۔

اس کے بعد بریلی میں جمعیۃ علما کا جلسہ ہوا اس کے صدر بھی مولانا آزاد ہی تھے اس جلسہ میں یہی تجاویز منظور کی گئیں۔

ترک موالات

ترک موالات کیا تھی اور اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ ۱۹۲۰ء میں حکام وقت کو رعایا کے بے دست و پا ہونے کی وجہ سے یقین تھا کہ تشدد کے ذریعہ سے رعایا کے سیاسی جذبات کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی نے نہتی رعایا کے لیئے ترک موالات کا طریقہ تجویز کیا، جس نے رعایا کو خفیہ سوسائٹیاں قائم کرنے سے بے نیاز کر دیا، جو باتیں اور مشورے پہلے زمانہ میں حکام اور پولیس سے چھپ چھپ کر کئے جاتے تھے وہ علانیہ کئے جانے لگے۔ ترک موالات کے متعلق ہندو مسلمانوں کی متفقہ قراردادوں کے مطابق ۱۹۲۱ء میں پوری قوت کے ساتھ ولائتی مال عدالتوں، وکالتوں، سرکاری ملازمتوں اور اسکولوں کا مقاطعہ کیا گیا اس مقاطعہ کا اثر حکومت کے طرز عمل پر پڑا۔

۱۹۲۲ء میں ہندوستان کی تحریک آزادی نے ایک نئی صورت اختیار کی، کانگریس میں دو پارٹیاں ہوگئیں ایک اصلاح پسند اور ایک انتہا پسند اصلاح پسند پارٹی کا خیال تھا کہ کانگریسی ممبر اسمبلیوں اور کونسلوں میں جاکر حکومت سے لڑیں، انتہا پسند پارٹی کا خیال تھا کہ کونسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ کیا جائے دونوں فریق میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک سال قید کاٹنے کے بعد جب جیل سے رہا ہوئے تو آپ نے ان دونوں فریق میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی اور مارچ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں آپ کا سمجھوتہ منظور کرلیا گیا

اتحاد کانفرنس

۱۹۲۲ء میں حکومت نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر کو جو اس وقت جیل میں تھے جیل سے بلاکر گفتگو کی جو صیغہ راز میں ہی اور ان کو رہا کردیا گیا جس کے بعد ہی انھوں نے مسلمانوں کی شدھی کرنے کا کام شروع کردیا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے ایک تعلیمی جلسہ میں ایک مسلمان وزیر تعلیم نے مسلمانوں کو تعلیم دی کہ وہ اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کریں اب کیا تھا دونوں طرف سے ملک میں شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ شروع ہوگیا اور اب جو ہندو مسلم بلوے شروع ہوئے انھیں کوئی قوت روکنے والی نہ تھی، شدھی اور تبلیغ تقریباً دو سال تک زور شور سے چلتی رہیں ان افسوسناک حالات کو دیکھکر ۱۵ ستمبر ۱۹۲۳ء کو دہلی میں مولانا ابوالکلام کی صدارت میں کانگریس کا ایک اسپیشل اجلاس ہوا جس میں ہندو مسلم اتفاق و رواداری

متعلق کوششیں کی گئیں۔

گاندھی جی کا برت

ہندوستان میں ہندو مسلم جھگڑوں کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا تھا، ٹوپی، چوٹی، دھوتی، تہبند کے معمولی معمولی امتیازات پر بے گناہ انسانوں کو ذبح کیا جا رہا تھا ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ تھا ملک میں کہیں امن وچین میسر نہ تھا دیسی پردیسی کا کوئی امتیاز نہ تھا شیرخوار بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا جاتا ان حالات کو گاندھی جی بھی نہ دیکھ سکے انھوں نے ملک میں امن قائم کرنیکی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی تب آپ نے ۲۷ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس روز کا برت شروع کیا اس سے شدھی سنگھٹن اور تحریک تبلیغ رک گئی، تمام فرقوں کے لیڈر دہلی آگئے اور ۲۳،۲۲ ستمبر ۱۹۲۳ء کو دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کانفرنس شروع ہوئی مولانا آزاد نے اتحاد کانفرنس کو اس کے مقاصد کے اعتبار سے کامیاب بنانے میں بہت کوشش کی جس میں آپ کو کامیابی ہوئی اس کامیابی کو دیکھکر کلکتہ کے لاٹ پادری نے کہا تھا کہ

مولانا آزاد جیسی ہستیوں پر ہندوستان کا مستقبل منحصر ہے۔

اس مضمون کی ایک تجویز پاس ہوئی کہ بلووں سے سخت تباہی ہو رہی ہے اس لیئے جملہ مذاہب کے لوگوں سے درخواست کی جائے کہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی جگہ پنچایتوں کے ذریعہ معاملات طے کریں اور بدرجہ مجبوری عدالتوں سے رجوع کریں۔ تجویز کے پاس ہونے پر گاندھی جی نے

۱۸ اکتوبر کو اپنا برت ختم کیا اور دہلی کی تاریخ نے اس روز بھرت ملاپ کا منظر پیش کیا اس روز دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے گلے ملے جہاں تک ہندو مسلم اتحاد کانفرنس کا تعلق ہے وہ مولانا کی کوششوں سے کامیاب ہو چکی تھی لیکن بعض فرقہ پرست مذہب کے نام پر لوگوں کو بھڑکاتے اور فساد کراتے رہے جس سے ملک میں امن وامان کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بنگال آرڈی نینس نافذ ہونے کے بعد بمبئی میں تمام جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس میں ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے مقصد سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ مولانا آزاد بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے ستمبر ۱۹۲۷ء میں شملہ میں پھر اتحاد کانفرنس ہوئی جس میں آپ نے بڑا سرگرم حصہ لیا اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک اپیل بھی شائع کی۔

ملتان میں فرقہ وارانہ جھگڑے کی وجہ سے پنجاب کی فضا خاص طور پر خراب ہو رہی تھی اس فساد کی تحقیقات کرنے کے لیئے مولانا آزاد حکیم اجمل خاں پنڈت موتی لال نہرو پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے پنجاب میں جاکر حالات کا مطالعہ کیا اور رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کی کہ پنجاب کی فضا ملتان اور مالا بار کے ہندو مسلم فساد کی وجہ سے خراب ہو رہی تھی اس کمیٹی نے شدھی اور ہندو سنگھٹن کی تحریکوں کو بھی اس کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

جون ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں امرت سر میں نشنل سکھ لیگ کی کانفرنس ہوئی جس میں مولانا کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی لیکن آپ صحت کی خرابی کی وجہ

ں کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے اور ایک پیغام سکھ قوم کو دیا کہ وہ ہندو مسلم
تہ کرانے میں مدد دیں اور سکھ جو مستقل ارادہ رکھنے کی وجہ سے ممتاز ہیں
ر پختہ ارادہ سے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اس مقدس
ں کامیابی ہو سکتی ہے، سکھ جو گورو کے باغ کے مورچہ میں نوکر شاہی
چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں ہندوؤں اور مسلمانوں
ہمی اختلافات کشیدگی اور کدورتوں کو شکست دیں۔

نوری ۱۹۲۵ء میں مولانا پنڈت موتی لال نہرو کے ہمراہ ناگپور کے
سلمانوں میں سمجھوتہ کرانے کے لئے تشریف لے گئے اور دو دن کی
نوں کے بعد ان میں باہمی فیصلہ کرا دیا۔

ن کمیشن

۱۹۲۷ء میں کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا جو ہندوستان میں
جدید اصلاحات دئے جانے کی تحقیقات کے لیئے
ھا مگر اس کے کل ممبر انگریز تھے جس سے اہل ہند میں عام ناراضی پیدا
۔اس کمیشن کو ناکام بنانے کیلئے آپ نے سرگرم کوشش کی ۱۲ رنومبر ۱۹۲۷ء کو
ں مولانا کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں اس کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا
یا گیا ۔اس سلسلہ میں آپ نے جنوری ۱۹۲۸ء میں لاہور، امرتسر، راولپنڈی
ں وغیرہ مقامات کا دورہ کیا اور پبلک جلسوں میں تقریریں کیں ۲۷ رجنوری
میں آپ ہی کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں آپ نے پبلک سے
۔ذیل خطاب کیا کہ

اگر آپ ۲ر فروری کو سائمن کمیشن کی دہلی میں آمد پر قومی مفاد
کی خاطر شہر میں مکمل ہڑتال بھی نہیں کر سکتے تو سوراجیہ کے
خیال کو ہی دل سے نکال دو اور آزادی کا نام بھول کر
بھی نہ لو۔

ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا اور یہ سب مولانا کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی

اس پارٹی کا پہلا جلسہ ۲۷ر جولائی ۱۹۲۹ء کو الہ آباد میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مسلمانوں میں حب الوطنی پیدا کی جائے اور انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شریک ہوں اور اکثریت اور اقلیت کے درمیان ایسے تعلقات پیدا کئے جائیں جن سے اکثریت کے لوگ وسعت قلب کے ساتھ مسلمان اقلیت کے حقوق تسلیم کر لیں۔ اس جماعت کے مستقل صدر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری خزانچی اور مسٹر تصدق احمد خاں شروانی سکریٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۳۰ء کی آمد پر ملک میں زندگی کا ایک نیا جوش پیدا ہو رہا تھا۔ کانگریس اپنا نصب العین "مکمل آزادی" قرار دے چکی تھی اور اس نصب العین کے لئے لڑائی کا ذکر چھڑ چکا تھا۔ لوگ آزادی کی جنگ کو کامیاب بنانے کی تیاریاں

ہیں معروف تھے مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی طرف سے مسلمانوں کے نام ایک اپیل شائع کی کہ

کانگریس نے اپنے نصب العین میں جو تبدیلی کی ہے اس کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہندوستانی عوام اپنی ذات پات اور مذہب کے اختلافات کو بھول کر ایک ہو جائیں اور چونکہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیئے جدوجہد شروع ہو چکی ہے اس لیے حقوق کی تقسیم کا سوال ملتوی ہو گیا ہے۔ کیونکہ لڑائی کے وقت حقوق کی تقسیم کا ذکر خواہ وہ حقوق کتنے ہی منصفانہ کیوں نہ ہوں نامناسب اور بے محل ہوتا ہے اس لئے کانگریس کے لاہور کے فیصلے کے بعد حالات کا تقاضا ہے کہ حقوق کی تقسیم کی جگہ آزادی کی لڑائی لے، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ کانگریس کی آواز پر آگے بڑھیں اور قومی آزادی کی لڑائی کو کامیاب بنا کر دم لیں۔

اب چونکہ کانگریس نے نہرو رپورٹ کو ترک کر دیا ہے اور اب وہ ایسا کوئی آئین بنانے کی کوشش نہ کرے گی جس سے اقلیتیں مطمئن نہ ہوں اس لئے مسلمانوں کا دہرا فرض ہو گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کانگریس کی حمایت کریں۔

مسلمان کسی اچھے کام میں پیچھے نہیں رہے اب ملک کی آزمائش کے اس موقع پر ان کا اولین فرض ہو گیا ہے کہ وہ کانگریس کا ساتھ دیکر ہندوستان کے قابل شہری کہلانے کے دعویدار بنیں۔

تحریک آزادی ۲۱ مارچ ۱۹۳۰ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جنگ آزادی

کا اعلان کر دیا اور ۶؍اپریل کو تمام ملک میں ستیہ گرہ کی لڑائی پورے زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ دوسرے مسلم لیڈروں کے ساتھ مولانا آزاد نے ۱۳؍مارچ کو بمبئی سے ایک اور بیان شائع کیا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ آزادی کی لڑائی میں حصہ لیں اور ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے ستیہ گرہ کی تحریک کو تقویت پہنچائیں۔

سول نافرمانی

۲۶؍جنوری ۱۹۳۰ء کو تمام ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا اور گاندھی جی ۱۲؍مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لئے اپنے سفر پر پاپیادہ روانہ ہوئے۔ اب رعایا اور حکومت کے درمیان ۱۹۳۰ء کے بعد یہ سول نافرمانی کی جنگ شروع ہوئی جو نہتی رعایا کے نزدیک پُرامن تھی اور حکومت کے نزدیک تشدد آمیز تھی اور جس میں گرفتاریوں، لاٹھیوں، بندوقوں کی باڑھ، اراضی کی ضبطیوں کا دور دورہ تھا۔

ڈکٹیٹر

گاندھی جی گرفتار ہو گئے۔ ۱۰؍اگست ۱۹۳۰ء کو سردار پٹیل بھی گرفتار ہو گئے انھوں نے اپنی جگہ مولانا آزاد کو ڈکٹیٹر مقرر کیا، حکومت مولانا کی سرگرمیوں کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور ڈکٹیٹری کے گیارہ روز بعد ۲۱؍اگست کی شام کو آپ کو کلکتہ میں بنگال آرڈیننس کے ماتحت میرٹھ میں کی گئی ایک تقریر کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا ۲۳؍اگست کو آپ میرٹھ لائے گئے اور جیل کی کوٹھری میں بند کر دئے گئے۔ آپ کی گرفتاری پر تمام ہندوستان

میں ہڑتال کی گئی۔

۲۶ اگست کو میرٹھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ مسٹر کاگ ہل کی عدالت میں آپ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ ۱۹۳۰ء کے چھٹے آرڈیننس کے ماتحت ملزم قرار دئے گئے۔ مولانا نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا عدالت نے آپ کو چھ ماہ قید محض کی سزا دی۔ سزا کا حکم سن کر آپ بہت خوش ہوئے۔

گاندھی جی کی رہائی

پہلی گول میز کانفرنس میں گاندھی جی شریک نہ تھے اور جب دوسری گول میز کانفرنس کا وقت آیا تو وہ جیل میں تھے۔ حکومت نے گاندھی جی اور ممبران ورکنگ کمیٹی کو ۲۶ر جنوری ۱۹۳۱ء میں غیر مشروط طریقہ پر جیل سے رہا کر دیا تاکہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے مسئلے پر غور کر سکیں۔ وائسرائے اور گاندھی جی کی گفتگو ایک ہفتہ تک ہوتی رہی ۵ر مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی ارون معاہدہ مکمل ہو گیا جس کی رو سے مشروط طریقہ پر سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی اس پُرامن جنگ میں سزا پانے والوں کی تعداد تقریباً ۹۰۰۰۰ ہزار ہوئی۔ مولانا آزاد آزادی کی دوسری لڑائی کے لئے جو ایک سال بعد شروع کی گئی تھی تیاری میں لگ گئے۔

۲۸، ۲۹، ۳۰ر مارچ ۱۹۳۱ء کو کراچی میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں گول میز کانفرنس کے لئے گاندھی جی کو کانگریس کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ ۲۶ر اگست کو گاندھی جی لندن روانہ ہو گئے اس وقت ملک میں سکون تھا۔ ۸ر جولائی کو بمبئی میں مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولانا

نے مشترکہ انتخاب کی حمایت کی۔ ۱۸ر جولائی کو مولانا میرٹھ میں یو-پی کی قوم پرور مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے اور ۲۹ر جولائی کو کشمیر کے بلوہ کے سلسلہ میں کری نگر تشریف لے گئے۔ اکتوبر کے مہینہ میں پنجاب میں قوم پرست مسلمانوں کی کانفرنس ہوئی جس کے صدر آپ منتخب ہوئے لیکن خرابیٔ صحت کی وجہ سے آپ شریک نہ ہو سکے۔

کانگریس کا اجلاس مین پوری میں ہونے والا تھا جس کی صدارت کے لئے مولانا کا نام پیش کیا گیا ۱۹۳۲ء کے شروع میں جب گاندھی جی گول میز کانفرنس سے ناکام واپس آئے تو ملک میں پھر آزادی کی جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مولانا نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ ایک بیان شائع کیا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ستیہ گرہ کی لڑائی میں جو کانگریس شروع کرنے والی تھی حصہ لیں۔

۲۴ر جنوری ۱۹۳۳ء کو لکھنؤ میں ہندوستان کے مسلم لیڈروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں جو سب کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ حکومت کی سرحدی فارورڈ پالیسی کی مخالفت میں بھی ایک ریزولیشن پاس ہوا۔ ۱۵ر فروری کو کانگریس کے قائم مقام ڈکٹیٹر سردار سردول سنگھ گرفتار کر لئے گئے انھوں نے مولانا آزاد کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔

۲۴ر فروری کو حکومت کی طرف سے ہنگامی احتیاطات کے ماتحت

کے ماتحت آپ پر ایک حکم کی تعمیل کرائی گئی کہ سول نافرمانی کے کسی کام میں ایک ماہ تک حصہ نہیں لے سکتے لیکن آپ نے علانیہ طور پر اس حکم کی خلاف ورزی کی، ۶ مارچ کو دہلی میں آپ کی کوٹھی پر پولیس کا سخت پہرہ لگا دیا گیا اور ۲۰ مارچ کو دن کے گیارہ بجے پولیس کی ایک زبردست جماعت نے کوٹھی کا محاصرہ کر کے آپ کو گرفتار کر لیا اور دہلی ڈسٹرکٹ جیل میں نظر بند کر دیا۔ پھر آپ ۲۱ مئی کو رہا کر دئے گئے۔

کمیونل اوارڈ

ستمبر ۱۹۳۲ء میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے بارہ میں مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم کا فیصلہ ثانی انگلستان سے آیا جس سے سارے ملک میں بےچینی پھیل گئی۔ مولانا آزاد نے اس کے متعلق ۷ ار اکتوبر کو ایک بیان شائع کیا جس میں کمیونل ایوارڈ کو ملک کے لئے نقصان دہ اور خطرناک بتایا۔ فرقہ وارانہ فیصلہ کی موجودگی میں پھر ایک مرتبہ ہندو مسلم سمجھوتہ کرانے کی مولانا نے کوشش کی۔ پنڈت مالویہ اور مولانا شوکت علیؒ کے ہمراہ اس سلسلے میں آپ نے اتنا کام کیا کہ صحت خراب ہو گئی۔

۱۶ ر اکتوبر کو لکھنؤ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہوئی جس میں آپ نے مشترک انتخاب کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ ۲ ر نومبر کو الٰہ آباد میں ایک اور اتحاد کانفرنس ہوئی اس میں ہندو مہاسبھا، راشٹریہ ہندو سبھا، کانگریس، لبرل پارٹی نیشنلسٹ پارٹی، ٹریڈ اینڈ کامرس، زمیندار پارٹی، خلافت کمیٹی، مسلم کانفرنس مسلم لیگ، مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیۃ علما، احرار، شیعہ کانفرنس، مسلم لیگ

سکھ خالصہ، دربار سکھ نیشنلسٹ، ہندوستانی عیسائی پارٹی وغیرہ جماعتوں کے ۱۲۱ نمائندے شریک ہوئے جس میں ۶۳ ہندو، ۳۶ مسلمان، ۱۱ سکھ اور ۲ ہندوستانی عیسائی تھے ۱۷ روز میں تقریباً ڈیڑھ سو گھنٹے کی طویل بحث کے بعد یہ اتحاد کانفرنس کامیاب ہوئی لیکن ابھی ملک کی بدبختی کا دور ختم نہیں ہوا تھا چند لیڈروں نے فرقہ وارانہ حلقہ میں اپنی لیڈری قائم رکھنے کے لئے اتحاد کانفرنس کے فیصلوں کی مخالفت کرنا شروع کردی، مولانا نے ۲۶ دسمبر کو کلکتہ کے البرٹ ہال میں پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ان لیڈروں کی پول کھولی جو قوم اور ملک کی مخالفت کر رہے تھے،

کانگریس پارلیمنٹری بورڈ

۱۹۳۲ء کی تحریک سول نافرمانی جب ختم ہوگئی تو لوگوں نے کانگریس کے آئین میں تبدیلی کا مطالبہ شروع کیا اور چاہا کہ کانگریس اسمبلیوں اور کونسلوں میں جانے کی اجازت دیدے۔ مولانا آزاد انقلاب پسند طبقہ میں سے تھے اور ذاتی طور پر اگرچہ یہ خیال رکھتے تھے کہ کانگریسی ممبروں کو اسمبلیوں اور کونسلوں میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ اس بات کے بھی خلاف نہ تھے کہ اسمبلیوں اور کونسلوں سے اگر آزادی کی جنگ کو قوت پہنچے تو اس سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ آخرکار ۱۸ مئی ۱۹۳۴ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس پٹنہ میں ہوا اس اجلاس میں ایک سب کمیٹی بنائی گئی یہ کانگریس کا پارلیمنٹری بورڈ تھا مولانا آزاد اس کے ممبر بنائے گئے۔

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کا عام انتخاب ہونے والا تھا اس کے جیتنے کے لئے پوری سرگرمی کے ساتھ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گاندھی جی نے "مینوفسٹو" تیار کیا جسے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۲۷ جولائی ۱۹۳۴ء کو منظور کیا، کانگریس کے انتخابی مینوفسٹو میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے ممبر اسمبلی میں جاکر وائٹ پیپر کو رد کرائیں گے۔ سخت گیری کے قانون کو مسترد کرانے اور عام ہندوستانیوں کی بھلائی کے قانون پاس کرانیکی کوشش کریں گے، کانگریس نے انتخاب کی لڑائی پوری سرگرمی سے شروع کردی۔ تحریک نافرمانی بند ہونے کے بعد ملک میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اُس میں ایک دم حرکت پیدا ہو گئی۔ مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کانگریس کے ۴۵ ممبر کامیاب ہو گئے اس کامیابی میں مولانا ابوالکلام کا بہت بڑا حصہ تھا جنھوں نے پارلیمنٹری بورڈ کے دوسرے ممبروں کے علاوہ صدر کی حیثیت میں خود بھی بڑی دلچسپی لی۔

کانگریسی وزارتیں

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں کانگریس کا نیا آئین بنایا گیا اور گاندھی جی کانگریس کی ممبری سے الگ ہو گئے اس پر ملک میں بےچینی پھیل گئی، مولانا آزاد نے بھی گاندھی جی کے اس فیصلے کو بہت خطرناک بتایا۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پارلیمنٹ میں پاس ہو گیا تھا اور ملک معظم نے بھی اس پر دستخط کر دیئے تھے، برطانوی حکومت ہندوستان میں صوباتی آزادی رائج کرنیکی تیاریاں کر رہی تھی اور

اور کانگریس میں اس کے خلاف زبردست پروٹسٹ پایا جاتا تھا اور وہ اس کے لیئے تیار نہ تھی کہ پردیسی حکومت اپنا بنایا ہوا آئین ہندوستانیوں کی مرضی کے خلاف ان پر تھوپے۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس کی میٹنگ ہوئی جس میں اس معاملے پر بڑی بحث ہوئی کہ نئے آئین کے ماتحت صوبجاتی خودمختاری میں کانگریس کو وزارتیں قبول کرنی چاہئیں یا نہیں، سوشلسٹ اور انتہا پسند طبقہ وزارتیں قبول کرنے کے خلاف تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبر بھی جن میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک تھے وزارتیں قبول کرنے کے خلاف تھے لیکن بابو راجیندر پرشاد مولانا آزاد اور سردار پٹیل وغیرہ وزارتیں قبول کرنے کے حق میں تھے

دسمبر ۱۹۳۶ء میں فیض پور کانگریس ہوئی۔ لیکن وہاں بھی مسئلہ انقطاعی طور پر طے نہ ہوسکا۔ ان دنوں صوبجاتی اسمبلیوں کے انتخاب ہو رہے تھے فیض پور کانگریس کے بعد تمام کانگریسی لیڈر انتخابی مہم میں لگ گئے اور ان کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ کانگریس کو گیارہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں یعنی یوپی۔ سی پی۔ بہار۔ اڑیسہ اور بمبئی کی اسمبلیوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور دو صوبوں میں یعنی آسام اور صوبہ سرحد میں کانگریس پارٹی کے ممبروں کی تعداد دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ لیکن مجموعی طور سے کانگریس اکثریت میں نہیں تھی

چھ صوبوں میں ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ وہاں کانگریس کے بغیر کسی آئینی حکومت کا چلنا بالکل ناممکن تھا اس لئے ایک وزارتوں کا معاملہ اور زیادہ دلچسپی اور

اہمیت اختیار کر گیا۔

دہلی کنونیشن مارچ ۱۹۳۷ء میں دہلی میں نیشنل کنونیشن کی گئی جس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے علاوہ وہ سب لوگ بھی شریک ہوئے جو کانگریس کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلیوں یا کونسلوں کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ ان کی تعداد ساڑھے سات سو کے قریب تھی۔ اس کنونیشن میں تین روز کی زبردست بحث کے بعد ۱۷ مارچ کو جب کہ نئے آئین کے نفاذ میں صرف چودہ روز باقی رہ گئے تھے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس کو وزارتیں قبول کرنے سے پہلے گورنروں سے یہ عہد لے لینا چاہیئے کہ وہ اپنے تحفظات کا استعمال نہ کریں گے۔ اور گورنر اس قسم کا عہد دے دیں تو وزارتیں قبول کر لی جائیں اور اگر عہد نہ دیں تو وزارتیں قبول نہ کر کے صوبوں کی حکومتوں اور نظم و نسق میں جمود پیدا کر دیا جائے۔

صوبائی اسمبلیوں کے کانگریسی ممبروں اور کانگریس پارٹیوں میں ڈسپلن قائم رکھنے اور انھیں ضروری ہدایات دینے کے لیئے ایک پارلیمنٹری کمیٹی بنائی گئی جس میں سردار پٹیل اور راجندر بابو کے علاوہ مولانا آزاد بھی ایک ممبر مقرر ہوئے تھے جب گورنروں نے کانگریس پارٹیوں کے لیڈروں کو وزارت بنانے کی دعوت دی تو انھوں نے کانگریس کے حکم کے مطابق وہ عہد حاصل کرنے کے لئے شرط رکھی۔ لیکن کسی بھی گورنر نے اس شرط کو منظور نہ کیا۔ تب کانگریس پارٹیوں کے لیڈروں نے وزارتیں بنائے۔

انکار کردیا گورنروں نے نظم و نسق کا کام چلانے کیلئے کمزور وزارتیں قائم کرلیں۔ لیکن انھیں اسمبلیوں کا اجلاس بلانے اور بجٹ وغیرہ پیش کرنیکی ہمت ہی نہ ہوئی۔ اسی عرصہ میں کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ کی بات چیت ہوتی رہی اور جون کے مہینہ میں وائسرائے کے ایک توضیحی بیان کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں کانگریس پارٹیوں کے لیڈروں کو وزارتیں بنانیکی اجازت دیدی گئی۔ کمزور وزارتیں فوراً مستعفی ہو گئیں اور صوبوں کی حکومت کانگریس کے ہاتھ آئی۔ اس کے بعد صوبہ سرحد اور آسام میں بھی کانگریس نے مشترکہ وزارتیں قائم کرلیں۔ اور ہندوستان کے آٹھ صوبوں کی حکومتوں پر کانگریس کا تسلط قائم ہوگیا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت قائم کرنے میں مولانا آزاد کی محنت اور سرگرمی کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔

ان صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہونے کے بعد مسلم وزیروں کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا جو مولانا کے سپرد کیا گیا۔ اسمبلیوں میں جہاں تک مسلم لیگ پارٹی کا تعلق تھا۔ ان کے ممبروں کی اکثریت تھی مولانا آزاد اور مسلم لیگ کے لیڈروں میں وزارت کے معاملہ پر بہت طویل تبادلۂ خیالات ہوا۔ لیکن چونکہ مسلم لیگ اس بات کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ کانگریس کے حلف نامہ پر دستخط کرے اس لیئے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کے لیئے مسلم لیگی ممبروں کو وزارتوں میں شامل کرنا بالکل ناممکن ہوگیا تھا۔ مولانا آزاد نے

نے اسی سلسلہ میں ایک بیان بھی دیا تھا کہ جب تک مسلم لیگ یا کسی اور پارٹی کا ممبر کانگریس کے حلف نامہ پر دستخط نہ کرے اُسے کانگریس کی وزارت میں ہرگز نہیں لیا جا سکتا اس پر مسلم لیگی بہت بگڑے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں صوبہ سرحد میں آئینی حالت بہت نازک ہو گئی اور مرحوم سر سعداللہ کی وزارت کمزور ہونے لگی۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۹ تھی اور کانگریس کو اپنی اکثریت بنانے کے لئے صرف چار ممبروں کی ضرورت تھی مولانا آزاد بابو راجندر پرشاد کے ہمراہ فوراً ایبٹ آباد گئے۔ صوبہ سرحد کے آزادی پسند اور غیور پٹھانوں نے آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا اور ۲۳ ستمبر کو ڈاکٹر خان صاحب کی صدارت میں ایک عظیم الشان پبلک جلسہ ہوا جس میں دونوں رہنماؤں کی تقریریں ہوئیں اور مولانا کی خدمت میں ایڈریس پیش کئے گئے مولانا نے اپنی تقریر میں اس وقت پٹھانوں کی بہادری فراخدلی ہمت اور سادگی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ پٹھانوں میں صرف اپنی ہی نہیں بلکہ ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں کے لئے آزادی حاصل کرنیکی طاقت ہے۔

مولانا نے صوبہ سرحد کی اسمبلی کی مختلف پارٹیوں کے ممبروں سے ملاقات کی اور وہاں کانگریس کی وزارت قائم کرنیکی کوشش کی۔ ۵۔ ۶ روز کی کوشش کے بعد آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور دوسری پارٹی کے ممبروں نے کانگریس کے حلف نامہ پر دستخط کر دیئے اور کانگریس کے پروگرام کی حمایت کرنے کا اعلان کیا۔

بہار میں کسانوں اور زمینداروں کی کشمکش بہت زور پکڑ چکی تھی اس لئے آپ نے ۲۲ر نومبر ۳۷ء کو ان کے جھگڑے کا فیصلہ کرانیکی کوشش کی جس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ بہار میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ بھی ان دنوں بہت زور پکڑ گیا تھا اور کانگریسی وزارت کے خلاف بہت بےچینی پیدا ہو رہی تھی جبکہ آپ نے مداخلت کی اور سب سے پہلے ہزاری باغ جیل میں جاکر سیاسی قیدیوں کی بھوک ہڑتال ختم کرائی

جولائی ۳۸ء میں سی پی کی کانگریسی وزارت اور کانگریس پارٹی کے ممبروں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور ڈاکٹر کھرے نے گورنر سی پی سے مل کر اپنی وزارت قائم کرلی۔ معاملہ بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ اس لئے آپ نے وہاں جاکر اور صورت حالات کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر کھرے کو قصوروار ٹھیرایا۔ اور انھیں مجبور کیا کہ وہ وزارت سے استعفٰے دیں۔ ڈاکٹر کھرے کی وزارت کو توڑ گیا اور اس کے بعد کانگریس پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں پنڈت روی شنکر شکلا کو لیڈر چنا گیا اور وہ سی پی کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اس جمود کو حل کرنے میں آپ کی معاملہ فہمی نے بہت کام دیا۔ ۲۶ر اگست ۳۸ء کو آپ بذریعہ ہوائی جہاز کراچی تشریف لے گئے۔ وہاں اللہ بخش کی وزارت اور کانگریس پارٹی میں زمین کا لگان بڑھانے کے مسئلے پر اختلاف ہوگیا تھا آپکی کوششوں سے وہ اختلاف بھی دور ہوگیا۔ وسط ستمبر ۳۸ء میں آسام میں سر سعداللہ کی وزارت عدم اعتماد کی تحریک پاس ہو جانے کی وجہ سے ٹوٹ

ٹوٹ گئی اور وہاں ایک مشترکہ وزارت قائم کرنیکی ضرورت سمجھی گئی چنانچہ آپ شیلانگ تشریف لے گئے۔ آسام اسمبلی میں کل ۱۰۸ ممبروں میں سے کانگریس پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۳۷ تھی اور دوسری پارٹیوں کے چند ممبر بھی کانگریس کے پروگرام کی حمایت کرنے کو تیار تھے اس لیئے آپ کو اس جگہ بھی کامیابی ہوئی اور آسام میں بھی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر گوپی ناتھ نے مشترکہ وزارت قائم کی۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں آپ الہ آباد تشریف لے گئے اور وہاں یوپی ٹیننسی بل کے سلسلے میں زمینداروں کے رویہ پر کانگریس پارٹی کے ممبروں سے تبادلہ خیال کیا۔ ۲۱ دسمبر کو بہار میں ہندوستانی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت آپ نے فرمائی۔ اس کمیٹی میں ہندوستانی ڈکشنری گرامر اور ہندوستانی زبان کے متعلق چند اہم امور پر غور کیا گیا۔ فروری ۱۹۳۹ء میں صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت اور وہاں کی صوبہ کانگریس کمیٹی میں اختلاف پیدا ہو گیا چنانچہ آپ ۱۶ فروری کو پشاور پہنچے اور ان کے باہمی اختلافات ختم کر کے ان میں اتحاد کرادیا۔ اس دفعہ آپ کو اسلامیہ کالج یونین کی طرف سے ایڈریس بھی پیش کیا گیا۔

ہندو مسلم سمجھوتہ کی بات چیت

مختلف صوبوں میں کانگریس پارٹیوں کی رہنمائی کرتے ہوئے آپ اپنی زندگی کے ایک عظیم مقصد ہندو مسلم اتحاد سے لاپرواہ نہیں ہوئے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں

آپ نے مسٹر جناح سے بمبئی میں ملاقات کی اور مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہندو مسلم سمجھوتہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ۲۸ جنوری کو بمبئی میں گاندھی جی اور مسٹر جناح میں ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد مئی میں مسٹر سوبھاش چندر بوس بھی جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے مسٹر جناح سے ملے اور سمجھوتہ کی کوشش کی لیکن سب محنتیں بیکار گئیں کیونکہ مسٹر جناح نے نامناسب رویہ اختیار کیا اور کانگریس کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کرنے اور نکتہ چینی کرنے کی روش جاری رکھی۔ اس پر آپ نے ۹ جون ۳۸ء کو ایک بیان شائع کیا کہ ایسے وقت میں جبکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ کی بات چیت چل رہی ہے اور کانگریس اپنے ہندو مسلم اتحاد کے مقصد کی تکمیل کے لئے اتنا آگے بڑھ چکی ہے پبلک طور سے ایک دوسرے پر الزام لگانا اور پبلک جلسوں میں بے کار بحث چھیڑنا نامناسب ہے اور کم از کم ذمہ دار لیڈروں کو اپنی پوزیشن اور وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو ایسے جوش کے ساتھ ظاہر کرنے سے باز آنا چاہئے۔ یہ رنج کی بات ہے کہ پچھلے دنوں میں مسٹر جناح کی تقریروں کے جو حصے اخباروں میں چھپے ہیں ان میں خاص طور پر اتہام تراشی کی گئی ہے جو توقع کے بالکل خلاف ہے۔

بنگال کے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق نے کہا تھا کہ کانگریسی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں پر بہت ظلم کیئے گئے ہیں۔

مولانا نے مسٹر فضل الحق کو چیلنج کیا کہ وہ ایسے کسی بھی ایک کانگریسی

صوبہ کا نام بتائیں جہاں مسلمانوں کو تنگ کیا گیا ہو اور اگر ان کے لگائے ہوئے الزام صحیح ثابت ہوئے تو میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کی ساری شکایتیں دور کرانیکی کوشش کیجائیگی لیکن میری یہ صاف رائے ہے کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہیں اور کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر کہیں بھی ظلم نہیں کئے گئے۔

سندھ کی اللہ بخش وزارت اور کانگریس پارٹی میں سکھر کے بندر کے متعلق پھر اختلاف پیدا ہوگیا تھا اور مسلم لیگیوں نے اس واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھاکر مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ اس وقت آپ نے ایک طویل بیان شائع کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ سندھ کی کانگریس پارٹی ایک خاص اصول اور نصب العین کی علمبردار ہے اور جو وزارت کانگریس کے پروگرام کو پورا کرے گی۔ کانگریس پارٹی اس کا ساتھ دے گی۔ اور اگر اصول کی پروا نہ ہوتی تو کانگریس موجودہ وزارت پر نہایت آسانی سے حاوی ہو سکتی تھی۔

عید کی امامت

اس قسم کے صاف بیانوں سے فرقہ پرست مسلمان آپ کے خلاف ہو گئے اور عید کی نماز کا مسئلہ لیکر آپ کے خلاف ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع کردیا۔ آپ کلکتہ میں کئی برس سے امام کی حیثیت سے عید کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن نومبر ۳۸ء میں کچھ مسلم لیگیوں نے اس کی مخالفت کی۔ یہ معاملہ عید کمیٹی کے سامنے پیش

ہوا اور اس نے یہ طے کیا کہ عید کی نماز مولانا آزاد ہی پڑھائیں لیکن آپ نے صاف اعلان کر دیا کہ عید جیسی مقدس تقریب میں میں مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے نہیں دینا چاہتا۔ اس لیئے میں امام کے عہدے سے استعفیٰ دیتا ہوں اور نماز نہ پڑھانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ اگرچہ اس اعلان سے مسلمانوں کی ایک زبردست اکثریت کو بہت رنج پہنچا۔ لیکن آپ اپنے فیصلہ پر قائم رہے

مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ یو۔ پی میں تبرا ایجی ٹیشن شروع کیا گیا جس سے مسلمانوں کے دونوں فرقوں شیعہ اور سُنی اختلاف کی خلیج بہت وسیع ہو گئی اور ان میں آپس میں مدح صحابہ اور تبرا کہنے پر خون خرابا بھی ہوا۔ یہ جھگڑا کئی ماہ تک چلتا رہا اور اس میں تقریباً دس ہزار مسلمان گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالے گئے۔ باہمی سمجھوتہ کے لئے بہت کوشش کی گئی۔ لیکن جب معاملہ کسی طرح بھی نہ سُلجھا تو مولانا آزاد لکھنؤ تشریف لائے اور لوگوں سے بات چیت کر کے سب سے پہلے ایجی ٹیشن بند کرایا اور پھر ۲۶ اگست ۱۹۳۹ء کو ایک بیان شائع کیا جس میں بتایا کہ آپ نے شیعہ اور سُنی مسلمانوں کے سامنے سمجھوتہ کی ایک تجویز رکھی تھی کہ اگر ایجی ٹیشن بند کر دیا جائے تو میں شیعہ اور سُنیوں کے نمائندوں کا اجلاس بلا کر اس مسئلے کو حل کرنے کے لیئے کسی سمجھوتہ کی راہ نکالنے کی کوشش کروں گا مگر بدقسمتی سے یہ کوششیں بیکار ہو گئیں۔ اب کانگریس پارلیمنٹری سب کمیٹی اس معاملہ پر غور

کرکے یو-پی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کو اس بارے میں ضروری مشورہ دے گی۔

جب باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو کانگریس یو-پی گورنمنٹ نے سُنیوں کا حق مدح صحابہ تسلیم کرلیا اور بارہ ربیع الاوّل کو مدح صحابہ کا ایک جلوس نکالنے کی اجازت دیدی۔ تبرہ ایجی ٹیشن خلافِ قانون قرار دیا گیا۔

تری پوری کانگریس اور اُس کے بعد

فروری ۱۹۳۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس تری پورہ میں مسٹر سوبھاش چندر بوس کی صدارت میں ہوا۔ اس کی صدارت کے لیئے شروع میں مولانا آزاد کا نام پیش کیا گیا تھا لیکن جب مسٹر سوبھاش چندر بوس نے صدر کانگریس کا انتخاب لڑنے کی خواہش ظاہر کی تو مولانا دست بردار ہو گئے اور مسٹر بوس کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے۔

اپریل کے پہلے ہفتہ میں گاندھی جی سیاسی نظر بندوں اور قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں بنگال تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے گورنر بنگال اور بنگال کے وزیروں سے بات چیت کی جس میں مولانا آزاد نے بھی حصہ لیا ان ملاقاتوں اور کوششوں کے نتیجہ کے طور پر ہزاروں نظر بندوں اور اسیروں کو رہا کر دیا گیا۔ بنگال صوبہ کانگریس کمیٹی کے جھگڑے بھی افسوسناک صورت اختیار کر گئے تھے اسکا تصفیہ کرانے کے لیئے بھی آپ نے ہی کوشش کی اور ۲۱ اپریل کو اپنی جائے رہائش پر ہی مسٹر سوبھاش چندر بوس سے جو اس وقت صدرِ کانگریس تھے ڈاکٹر بدھان چندر رائے کی ملاقات کرائی۔ ۱۲ مئی کو بمبئی میں

تمام کانگریسی صوبوں وزیر اعظموں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں آپ بھی شامل ہوئے اس کانفرنس میں مزدوروں کسانوں اور کھیتی باڑی زراعت تعلیم اور مجلسی بہبودی کے لیئے سب صوبوں میں ایک قسم کی مشترکہ اور متحدہ پالیسی اختیار کی گئی اور واردھا تعلیمی اسکیم پر بھی غور کیا گیا۔

ستمبر کے چوتھے ہفتہ میں دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا مسٹر سوبھاش چندر بوس صحت کی خرابی کی وجہ سے دیر میں پہنچے اس لئے صدارت مولانا نے کی۔ انھیں دنوں تری پوری کانگریس کے صدر کے انتخاب کا سلسلہ چل رہا تھا ملک میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا تھا جو اس مرتبہ آپ کو صدر کانگریس بنائے جانے کے حق میں تھا اور آپ نے ایک دفعہ کانگریس ہائی کمانڈ کو صدارت کے لیئے اپنی رضا مندی بھی دیدی لیکن صحت خراب ہونیکی وجہ سے آپ نے اس ذمہ داری کو سنبھالنے سے معذوری ظاہر کی اور مقابلہ مسٹر سوبھاش چندر بوس اور ڈاکٹر سیتا رامیہ میں رہ گیا۔ مولانا آزاد اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے باقی ممبروں نے ڈاکٹر سیتا رامیہ کے حق میں اپیل کی اور مسٹر سوبھاش چندر بوس سے دست بردار ہونے کی درخواست کی لیکن مسٹر بوس نے انتخاب لڑنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس سے ملک کی سیاست میں بڑی سرگرمی اور انتخابی کشمکش پیدا ہوگئی۔ انتخاب میں مسٹر سوبھاش چندر بوس تقریباً ڈیڑھ سو ووٹ کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ مہاتما گاندھی نے ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ کی شکست کو اپنی شکست قرار دیا اور کانگریس ہائی کمانڈ کے بارہ ممبروں نے اسے مہاتماجی

کی پالیسی پر عدم اعتماد کا ووٹ سمجھتے ہوئے ۲۳ رفروری ۱۹۳۹ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفےٰ دیدیا ان استعفےٰ دینے والوں میں مولانا آزاد بھی تھے اور اس طرح آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے جس کی آپ ۱۹۲۰ء سے مسلسل خدمت کرتے آرہے تھے الگ ہو گئے۔ ملک کے سرکردہ اور محترم لیڈروں کے استعفےٰ دینے سے سارے ملک میں ایک ہلچل مچ گئی اور کانگریس کے دونوں فرقوں میں سمجھوتہ کرانیکی کوشش شروع ہو گئی۔ مارچ کے وسط میں ملک کے سب لیڈر تری پوری (سی پی) میں جمع ہوئے اور وہاں بھی باہمی فیصلہ کرانیکی کوشش کی گئی لیکن بدقسمتی سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ۱۰ مارچ کو اسی حالت میں کانگریس کا اجلاس شروع ہو گیا مسٹر سوبھاش چندر بوس صدر کانگریس بیمار تھے اس لئے مولانا آزاد کو ہی صدر کانگریس کی گدی پر بٹھایا گیا آپ نے اِس اجلاس کی صدارت نہایت خوش اسلوبی سے کی اس کانفرنس میں یو۔پی کے وزیر اعظم پنڈت گوبند ولبھ پنت نے ایک ریزولیشن پیش کیا جس میں گاندھی جی اور پرانی کانگریس ورکنگ کمیٹی پر اعتماد ظاہر کیا گیا تھا یہ ریزولیشن اجلاس میں زبردست اکثریت سے پاس ہو گیا۔

حادثہ مولانا آزاد تری پوری سے واپس کلکتہ جا رہے تھے جبکہ راستے میں الہ آباد اسٹیشن پر اُتر پڑے اور ریلے کے پتے سے آپ کا پاؤں پھسل گیا۔ جس سے آپ کو گھٹنے میں سخت چوٹ آئی۔ علاج کے لیئے بارہ تیرہ روز تک الہ آباد میں ہی ٹھیرے اور گاندھی جی اور سردار پٹیل و دیگر لیڈر آپ

کی حالت دیکھنے کے لئے الٰہ آباد تشریف لائے ۲۷ر مارچ کو آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔

سبھاش بابو کا استعفےٰ

اپریل ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا گاندھی جی بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ مسٹر سوبھاش چندر بوس اور پرانی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں سمجھوتہ کرانے کے لئے اس جگہ بھی کوشش کی گئی گاندھی جی اور مسٹر بوس میں ذاتی طور سے تبادلہ خیال بھی ہوا لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا اور آخر کار ۲۹ر اپریل کو مسٹر سبھاش چندر بوس نے صدارت سے استعفےٰ دیدیا اور ان کی جگہ بابو راجیندر پرشاد کانگریس کے نئے صدر منتخب ہوئے جنھوں نے پرانی کانگریس ورکنگ کمیٹی کو پھر سے بحال کردیا اور سوا دو ماہ تک کانگریس ورکنگ کمیٹی سے علیحدہ رہنے کے بعد مولانا آزاد پھر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو گئے۔

دوسری جنگِ عظیم

جرمنی نے اگست ۱۹۳۹ء کے آخر میں پولینڈ پر حملہ کردیا۔ اور تین ہفتہ کی جنگ کے بعد پولینڈ پر قبضہ کرلیا اس میں روس کے ہاتھ بھی پولینڈ کا تقریباً نصف علاقہ آگیا۔ برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا اور یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں آپس میں الجھ پڑیں۔

اس بین الاقوامی صورت حالات کا ہندوستان کی سیاست پلازمی اور ناگزیر اثر پڑا اور کانگریس اور حکومت دونوں ... نے اپنے کیمپوں

میں تیاری شروع کردی۔ ۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مولانا آزاد نے کلکتہ سے ایک بیان شائع کیا جس میں ہندوستانی عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ بین الاقوامی نازک صورت حالات کی وجہ سے آپس کے فرقہ وارانہ اختلاف کو مٹا کر ایک ہو جائیں۔

کانگریس نے اپنے ایک ریزولیشن کے ذریعہ برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ جنگ کے متعلق اپنے مقاصد کا واضح الفاظ میں اعلان کرے لیکن چونکہ برطانی حکومت کی طرف سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا کہ اس لڑائی کے بعد جسے جمہوریت اور آزادی کی لڑائی کہا جا رہا ہے ہندوستان کا درجہ کیا ہوگا۔ اس لئے کانگریس نے آٹھوں صوبوں کی وزارت کو حکم دے دیا کہ وہ اپنی اپنی اسمبلیوں میں جنگ کے متعلق ایک ریزولیشن پاس کرکے جس میں جنگ کی جانب ہندوستانی عوام کا نظریہ ظاہر کیا گیا ہو استعفے دیدیں۔ چنانچہ آٹھوں کانگریسی وزارتوں نے یکے بعد دیگرے استعفے دیدیئے۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں دہلی میں ایک بار پھر گاندھی جی پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح نے آپس میں مل کر ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ حکومت کے رویہ سے ملک میں بہت بےچینی بڑھتی جاتی تھی۔ کانگریس نے ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کے ہاتھ میں پورے اختیار دیدیئے اور اگرچہ گاندھی جی نے اس کے بعد بھی وائسرائے سے ملاقات کی اور انھیں امید تھی کہ یہ جمود حل ہو جائے گا لیکن حکومت کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہیں کیا گیا جس سے پتہ چلے کہ وہ کانگریس اور خاص کر دیش کے مطالبے کو کس حد تک اور کب تک منظور کرنے کو

تیار ہے۔

رامگڑھ کانگریس ۶ رفروری کو رام گڈھ کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لئے کاغذات نامزدگی داخل ہوئے اور مسٹر ایم۔ این رائے مولانا آزاد کے مقابلے میں کانگریس کی صدارت کے لیئے امیدوار کھڑے ہوئے۔ کوشش کی گئی کہ اس دفعہ بھی صدر کانگریس کا انتخاب اتفاق رائے سے ہو جائے لیکن مسٹر رائے نے اصول کی خاطر اپنے کاغذ واپس لینے سے انکار کر دیا اور انتخاب لڑنے کا ہی فیصلہ کیا۔ کانگریس کے آئین کے مطابق ۱۵ رفروری کو تمام صوبوں میں صدر کانگریس کے انتخاب کے لیئے ڈیلی گیٹوں نے ووٹ دیئے اور مولانا آزاد ۱۸۶۴ ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوئے جبکہ آپ کے حریف مسٹر ایم۔ این رائے کو صرف ۱۸۳ ووٹ ملے آپ ایک ہزار ۱۶۸۱ ووٹوں کی اکثریت سے آئندہ سال کے لئے کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ انھیں دنوں آپ پنجاب کانگریس کی دونوں پارٹیوں کے جھگڑے طے کرانے کے لئے لاہور تشریف لے گئے تھے۔ وہاں آپ کئی روز تک ٹھیرے اور پنجاب کانگریس کے سب طبقوں کے ذمہ دار اصحاب سے بات چیت کر کے وہاں کے دونوں بڑے سرکردہ طبقوں میں اتحاد کرا دیا اور دس سال کے بعد پنجاب میں متحدہ عمل کا پھر دور پیدا کیا۔ آپ کے صدر منتخب ہونیکی اطلاع بھی آپ کو لاہور میں ہی ملی اور وہاں آپ کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی جس میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات

خاں دوسرے وزیر اور یونینسٹ پارٹی کے ممبر بھی شریک ہوئے اور انھوں نے آپ کی کامیابی پر آپ کو مبارکباد دی۔ آپ کی کامیابی پر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بڑی خوشی ظاہر کی گئی۔ بنگال کے ایک مسلم لیگی کارکن مسٹر سید احمد ظفر آبادی نے مولانا آزاد کو مبارکباد دیتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ میرا سیاسی اعتقاد آپ سے مختلف ہے لیکن میرا یہ پختہ یقین ہے کہ مسلمانوں میں صرف آپ کی ہی ایک ایسی ہستی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کر سکتی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرلنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا کی تصانیف

تذکرہ

مولانا کو علمی تحقیق کا ہمیشہ سے شوق تھا اور کثرت مطالعہ سے جو معلومات حاصل کیئے تھے اُن کو ایک جگہ جمع کردینے کا خیال پیدا ہوا لیکن مولانا کی مشغولیتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے اس علمی خیال کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ رانچی کی نظربندیوں کے زمانہ میں جبکہ آپ کی طبیعت یکسو ہوگئی اور ملک کی پالیٹکس سے بظاہر فراغت ملی تو آپ نے موقع کو غنیمت جان کر اپنے خاندان کے اہل علم اور ہندوستان کے مشاہیر علماء کا حال لکھنا شروع کیا اور تھوڑے سے ہی عرصہ میں چند کتابوں کی مدد اور حافظے کے بھروسہ پر ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ مرتب کردیا جس کا نام ”تذکرہ“ رکھا گیا

ترجمان القرآن

مولانا کو طالب علمی کے زمانہ ہی میں قرآن مجید کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی۔ قرآنی علوم کے متعلق مولانا نے کافی مطالعہ کیا۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کی تصانیف نے مولانا کو قرآن کے سمجھنے میں بہت مدد دی۔ مولانا نے قرآنی حقائق و معارف سمجھنے میں بڑی محنت کی۔ عام طور پر مسلمانوں میں قرآن سے بے توجہی اور اس سے لاعلمی کی جو حالت تھی اس نے مولانا پر خاص اثر کیا۔ آپ نے صرف قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ کا ارادہ کیا اور تعلیم سے فراغت پانے کے بعد قرآنی علوم کی تبلیغ و اشاعت میں جد و جہد کرنا شروع کر دی۔ وہ لوگ جو قرآن کی تعلیم سے بیگانہ تھے وہ جو قرآنی مسائل میں متفکر تھے وہ جو قرآنی آیات و حکم اور اوامر و نواہی کے منکر تھے مولانا کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا۔

عربی و فارسی کی تفاسیر کو چھوڑ کر اردو میں کوئی ایسی تفسیر نہ تھی جو تشنگان علوم قرآنی کو سیراب کرتی مولانا اس ضرورت کا احساس کیا اور ارادہ کر لیا کہ قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر لکھی جائے جو قرآن مجید کے سمجھنے میں مدد دے مولانا نے تفسیر کا کام شروع کر دیا اور وہ تمام رعایتیں جو قرآنی علوم کی حامل ہو سکتی ہیں ان کے پیش نظر قرآن کی ایک ایسی تفسیر مرتب کر دی جس نے اعلیٰ اور ادنیٰ تمام طبقوں کو فائدہ پہنچایا۔ انگریزی خواں اور علماء و مشائخ نے اس تفسیر سے برابر فائدہ اٹھایا۔ الحاد اور دہریت کے حامی شرک و بدعت

کے پرستار اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر سچے اور پکے مسلمان بنے۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں مولانا کی قرآنی معلومات کا اعتراف کیا گیا، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مولانا کے تبحر علمی اور خداداد قابلیت کا اقرار کیا گیا۔ مفہوم، اختصار اور سادگی کی اس تفسیر میں خاص رعایت رکھی گئی ہے ابتک اس تفسیر کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔

مضامین الہلال اور دوسرے اخبارات میں مولانا کے جو مذہبی اور تاریخی مضامین شائع ہو چکے ہیں ان کو اختصار کے ساتھ ہم اس کتاب میں لکھ رہے ہیں۔ اس کو پڑھ کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا بیک وقت محرر اور مقرر دونوں ہیں۔

مذہبی و سیاسی انقلاب

۱۹۱۲ء میں مسلمانان ہند کی سیاسی اور مذہبی حالت میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانان ہند تقریباً پولیٹیکل جدوجہد سے الگ تھے، مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی، مگر اس کا پالیٹکس صرف یہ تھا کہ ملک کی عام سیاسی ترقی کی روک تھام میں دفتری اقتدار کا ہاتھ بٹائے۔ اس لئے صاف صاف اعلان کیا کہ مسلمانوں کا کام یہ نہیں ہے کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہندوؤں کی پولیٹیکل جدوجہد کی مخالفت کرے۔ مذہبی علم و عمل سے عموماً ایک عام بے پروائی اور بے تعلقی چھائی ہوئی تھی۔ اسلام کا علاقہ برائے نام قومی رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ ہزاروں

تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو مذہب اور مذہب کے ہر خیال کی تحقیر کرنا اور اس کو خلاف عقل اور تہذیب بتانا قابل فخر کارنامہ سمجھتے تھے بات عام طور پر مسلم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ غیر انگریزی خواں طبقہ اگرچہ اس قدر مذہب سے بیگانہ تھا لیکن مذہب کی حقیقی زندگی اس میں مفقود تھی۔ یہ خیال ہر شخص پر چھایا ہوا تھا کہ اسلام کی تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا کو ترک کر دو اور صرف نماز روزہ اور وظائف میں زندگی بسر کرو زبان سے اگر کہا جاتا تھا کہ دین و دنیا کی کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جو قرآن شریف نے نہ بتلائی ہو لیکن یہ صرف خوش اعتقادوں کی بات تھی جو لوگ اس کو سچے دل سے مانتے تھے وہ بھی کبھی اس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے

قوم کا سب سے زیادہ محترم طبقہ علماء و مشائخ کا ہے لیکن اس کا یہ حال تھا کہ گویا اس کو مسلمانوں کی موت و حیات سے کوئی واسطہ ہی نہیں، یہ حالت تھی کہ کلکتہ سے "الہلال" نکلا اور اس شان سے نکلا کہ تمام ملک کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں اس کی ہر بات انقلاب انگیز تھی، مذہبی دعوۃ و تبلیغ پولیٹیکل پالیسی، علمی و ادبی مباحث طرز تحریر و انشا نے اس کے سواسب کو بھلا دیا، تمام پچھلے رنگ مٹ گئے، لوگ بے اختیار اپنی راہیں چھوڑ کر اسی کی راہ اختیار کرتے لگے۔ الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو تاریخ ہند میں یادگار رہیگا وہ مذہبی انقلاب ہے جو مسلمانوں میں اس کی دعوت حق سے پیدا ہو گیا۔ سیاست، معاشرت تعلیم، ساری باتوں کی اصل بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم قرار پا گئی اور آج تمام مسلمانوں پر جو رنگ چھایا ہوا ہے خواہ اس کا ظہور سیاسی مباحث میں ہو یا کسی

مضامین حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

خدا کی طرف پکار

آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لیکر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا، اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگان خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا، اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ "اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے، اور بیدار ہو، کیوں کہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے، پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے"!!

آج آنے والی بربادیوں اور ہلاکتوں سے نکلنے کے لئے تم بیقرار ہو، اور اس کے لئے طرح طرح کی تدبیروں کو سوچتے اور ڈھونڈھتے ہو۔ لیکن یہ کیا بدبختی ہے کہ ایک لمحہ اور ایک دقیقہ کے لئے بھی تمہارے دل میں یہ خیال نہیں گذرتا کہ سب سے پہلے اس کو تو اپنے سے راضی کرلیں، جس کے دروازے سے بھاگ کر ساری دنیا میں ہم نے ذلتوں اور نامرادیوں کی ٹھوکریں کھائیں — حالانکہ وہ کہہ چکا اور کہہ رہا ہے:

پھر اگر اٹھنا ہے تو اٹھ کھڑے ہو، کیوں کہ چلنے کا وقت یہی ہے اور اس کے بعد موت کے سوا کچھ نہیں۔ آج تم کو کوئی انجمن، کوئی جمع شدہ دولت اور روپیہ کی مقدار، کوئی پولیٹیکل سرگرمی، اور کوئی انسانوں اور ممبروں کے اجتماع محض کا ایک

جتھا، آنے والے مصائب سے نہیں بچا سکتا، جب تک کہ خود تمہارے اندر کوئی انقلابی تبدیلی نہ ہو۔ اور جب تک کہ تم اپنے خدا سے اُس کی راہ اور اُس کی مرضات کی راہ میں اپنے تئیں دے ڈالنے کا عملی عہد نہ باندھ لو اور اُسی کے بتلائے ہوئے طریقہ، اور اُسی کے حکم و ایما کے ماتحت ہو کر اُس کے نہ ہو جاؤ؛

پس یہی ہے جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں اور یہی دعوت ہے جس کی پکار کی راہ اُس نے مجھے دکھلائی ہے، میں اُٹھا ہوں، پس تم بھی اُٹھو، تاکہ ہم سب مل کر اُس کے دروازے کو کھٹکھٹائیں، اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اُسی کے ہو جائیں، پھر وہ جس طرف لیجائے اپنی تئیں چھوڑ دیں، کانٹوں پر لٹائے تو اپنے تلووں کو زخمی کر دیں اور پھولوں پر چلائے تو اُن کے لطف و راحت سے لذت اندوز ہوں، تلواروں کا زخم کھلائے، تو اُس کو غیروں کے مرہم سے زیادہ عزیز سمجھیں، اور زہر کا تلخ و مہلک جام دے تو اُسے شربت قند و گلاب کی طرح مزے لے لے کر پی جائیں۔

الحمدللہ کہ صدائے ”من انصاری الی اللہ“ کے لیئے وہی خدائے حکیم دلوں کو کھول رہا ہے جس نے اس صدائے دعوت الی اللہ و رسولہ کو بلند کرایا ہے۔ اس وقت تک روزانہ ایک سو درخواستوں کا اوسط ہے لیکن شاید ابھی بہت سے لوگ ہیں جو متامل اور بہت سے ہیں جو اصلیت و مقصد کی طرف سے پریشان ہیں، مگر وہ یاد رکھیں کہ حکمت الٰہیہ نے یہی طریق دعوت

اس لئے قرار دیا کہ اسس طرح سب سے اول ہی دلوں کی آزمائش اور دعووں کا امتحان ہو جائے جن کے دلوں میں سچا ولولہ ہوگا، وہ بغیر اصلیت کو پوچھے اُٹھ کھڑے ہوں گے، کیونکہ اُن کے لیئے اتنا اشارہ ہی کافی ہوگا کہ اللہ کی راہ کی دعوت اور اسلام کی ایک مخلص جماعت پیدا کرنا ہے، پھر خواہ اُس کی کوئی تدبیر اور کوئی پیرایہ ہو، کہ یہ امور وسائل و ذرائع ہیں اور اصل حقیقت اُن سے متاثر نہیں، ھٰذہٖ تذکرہ ط فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔

ہندوستان کی آزادی اور مسلمان

تاریخ آزادئ ہند جو ہونے والا ہے اُس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئیگا، جبکہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا، غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کر لیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کے متعلق کیا لکھا جائیگا۔

اس میں لکھا جائیگا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی ترقی کیلئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیئے ایک بدقسمتی، راہ آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پہ

ایک گھرازم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک پتھورہن کر رہی!

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت، اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا، جو اپنے دماغ سے نہ سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی، اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اُٹھا سکتی تھی، ایک معمول جو مسمرائزر کے ارادہ پر زندہ ہو، ایک وجود مثل بت جو صرف زمین کے لئے بار ہو، ایک درخت جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو، ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دئیے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسان کی پیشانی پر ہو۔

اسلام کی تذلیل کا ایک دردانگیز منظر

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اُس قوم کی تھی جو آہ ثم آہ ! کہ "مسلم" تھی جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی، جو دنیا میں اس لئے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے۔ جو اس لئے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے نہ اس لئے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں

پہنے، جو اس لئے آئی تھی کہ تمام اُن زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے اسلام کی اصطلاح میں بھی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دے نہ اس لئے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے۔ جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی، تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے۔ جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا تاکہ وہ اُٹھائے، نہ یہ کہ وہ خود خاک ذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اس ملتِ حنیفی کی پیرو تھی، جو دنیا میں صرف اس لئے ہے کہ حاکم ہو، نہ اس لیئے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی، اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے، جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب والقدس میں نہیں ہے۔ جو "مسلم" تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا، اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں، کیونکہ اس کے پاس "اسلام" تھا اور "اسلام" آگے رہنے کے لیئے ہے پیچھے رہنے کے لیئے نہیں۔ وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں، پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ہے۔

دماغ سوچنے کے لئے ہے نہ کہ غفلت کے لئے۔ پس تمہارے

پاس دماغ ہے تو اسے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو!
خدارا مجکو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمھاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟
یقین کرو اس وقت جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب
ہے۔ میری روح بیچین ہے۔ میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے
زخموں کے ٹانکے ہل گئے ہیں۔ اور میرے ہیجان وافکار کا ساتھ دینے
سے قلم عاجز آگیا ہے۔ یہ کیا ہے کہ میں ایک شئے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں
تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں۔ لیکن تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک
آواز میرے کانوں میں آرہی ہے میں سُن رہا ہوں پر تم نہیں سُنتے؟ آہ!
اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا تم کو کیا کہوں مجکو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے
کہ تم دین قویم کے پیرو، خطاب اسلام سے متصف اور امانت الٰہی کے
حامل ہو، یہ سچ ہے تو تم صرف اس لیئے ہو تاکہ نڈر رہو، بے خوف ہو،
جری ہو، آزاد ہو، خود مختار رہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو، بلکہ قوموں
کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بند استعباد سے نجات دلانے والے
ہو۔ اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لیئے ہو کہ تم جانفروش ہو، تاکہ راہِ
حق میں سر بکف ہو، پھر یہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں،
لیکن اے بدبختو! تم ان سے محروم ہو یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشائے عقل سوز ہے

تاریخ ہند کا ایک خاص باب

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیئے
بھی ایک شرف وعظمت کا باب ہے،

توتم خاموش ہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بیشک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لئے اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھا۔ مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے، انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا ہندوؤں نے اس کے لیئے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی، بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں

افسانۂ استبداد ہند

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا، اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے تھے، ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جا رہی تھی اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ھل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا، ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دیئے جا رہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے، مگر آبپاشی کے لئے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اگلے، زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ وفادار رہو، مگر اسلحہ کو چھونے کی اجازت نہ تھی، کہ تم غدار رہو، ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی تھی مگر ملک کے فاقہ مست کالے تعلیم اور حفظان صحت کے انتظام سے محروم تھے، نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر، اور تعلیم بھی ملتی تھی تو گھر بار بیچ کر۔ پھر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے

محبت کے لہجہ میں ۔۔دہ کیا گیا کہ تمیز رنگ و زبان اور امتیاز حاکم و محکوم کا یہاں گزر نہیں، اور جو راہ ۔۔۔ لئے باز ہے، وہی سب کی آمد کی منتظر لیکن جب پاؤں اُٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم و محکوم کے نشے سے بھرا انگلستان کی مٹی کا پتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے، جن میں ملک مبتلا تھا، ہندو اُٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لئے صرف کر دیا۔ لیکن عین اس وقت جبکہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے، بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لولا لنگڑا بنا دیں جبکہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے، تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لئے بیٹھے تھے ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ وہ وقت نہیں آیا۔ اور یہ اُسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا، جس نے جادو کے زور سے اُن کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا، پس یہ ملک کی ترقی کی راہ میں روک بنکر پڑے تھے۔

مسلمانوں کے ملکی کارنامے

اس کے بعد وہ آنے والا مؤرخ جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا، لکھے گا بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا، بیسویں صدی میں کوئی غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشن گورنمنٹ تھی۔ چنگیز خاں کا تخت قہر دتھا۔ پس ملک آزاد ہوا۔ اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن

دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا، جو مسلم نہ تھی، پر جو "مسلم" تھے انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ مذلت کی کوشش کی۔
ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہے۔ لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی، نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی، فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی۔ اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت خود اختیاری ملی، تو صرف ہندوؤں، قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے کیونکہ انھوں نے پالیٹکس شروع کیا، اور پھر پالیٹکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھکر کنارہ کشی کی، اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں، یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لئے روئیں، اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔

مسلم لیگ بیشک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے، جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتویٰ دینا پڑا۔ لیکن کیونکر؟ اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے، نہیں بلکہ

ع :- آں ہم بسعی غمزہ کردم شکار دوست

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے۔ اب انھیں کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر ان کے آگے سربسجود ہوں۔ بیشک شملہ

ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اُس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام "لیگ" رکھا گیا، لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اُس کا نام آتشکدہ رکھدو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائیگی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پتلا لیکر اُس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے، تاکہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر تالی بجائے، تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائیگا؟ نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجکو جواب دو! شاید آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالیٹکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہو گی۔ جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے اُسے چاندی اور سونے کے پوجنے والو! تم نے کی۔ تمہارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر، اور تمہارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہیں، تم نے غلامی کا ایک بتکدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا، تم نے سجدہ کا سر جھکایا اور قوم کو دھوکہ دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں۔ تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کود رہے تھے تاکہ اور خسف و غرق ہو، لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں تم خود گمراہ تھے۔ پر اس پر بس نہ کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا۔

سوال چھت کا نہیں بلکہ اُن اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں۔ پالیٹکس ایک آگ ہے جو خود بھڑکتی ہے، اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اولیں گمراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی اُمنگ اپنے جوش، اور اپنی کسی

قوت کے اعتماد پر نہیں، بلکہ محض کسی کے اشارۂ چشم، اور جنبش دست دعوت پر نتیجہ یہ ہوا کہ پالیٹکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا، اور راہ مقصود سے باز رہنے کے لیئے ایک کھلونے کا کام دینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صرف کیجانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کیجائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خرچ ہونا تھا، اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں صرف کیا جائے۔ یہ اس خمار کے لئے ترشی کا ایک پورا جرعہ ثابت ہوا اصل شے قوم کا یہ محسوس کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے، لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہو گی، خواہ اس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ محض معطی کے احسان وکرم پر اعتماد ہو گا۔ بیشک مسلمانوں کو اپنے حقوق قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیئے لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہئے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو، تم درختوں کے سائے میں آرام و راحت لیتے ہو، لیکن کبھی اس پر غور کیا ہے کہ تمہارے باورچیخانوں میں کونسی شئے جلتی ہے؟ وہ بھی درخت ہے لیکن جو درخت اپنی قوت نشو و حیات سے محروم ہو جاتا ہے اس کو کاٹ کر چولھے ہی کے حوالے کیا جاتا ہے پس زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے نہ کہ کسی کی چوکھٹ۔

ملک کی غلامی کے لیئے مسلمانوں کی قربانی

ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے۔ اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے

اور غنیم مطمئن ہے یہ خیال کرکے کہ تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی، اس لیئے تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو، غور کرو کہ حریفِ شاطر کی کس قیامت کی چال تھی ؟

سات کروڑ انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے، جبکہ تم اُس قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لیئے تیار ہو؟ یاد ہوگا کہ ہم نے ایک بار اس کی طرف اشارہ کیا تھا، ہندوستان میں قدرتی طور پر برٹش گورنمنٹ کو اپنے فوائد کے استحکام کیلئے ایک بڑی قربانی کی ضرورت تھی، کہ کوئی ایک قوم ملک کو چھوڑ کر اُس کے ساتھ ہو جائے اور اپنے ملک کی امیدوں کی قربانی کے خون سے اُس کے اغراض کے درختوں کو سینچے۔ مسلمانوں نے خود اپنے تئیں اس قربانی کے لیئے پیش کر دیا، اور جس بوجھ کے اُٹھانے سے ہندوستان کی تمام قوموں نے انکار کر دیا تھا، اس کے لئے اول روز خود ہی اپنی گردن پیش کر دی

اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عمل السحر نے بند نہ کر دیا ہوتا، تو وہ اس منظر کو دیکھتے اور خون کے آنسو روتے وہ دیکھتے کہ یہ کیا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے سے "ہندو مسئلہ" ہو گیا ہے، اور مسلمانوں کو من حیث القوم اس سے کوئی تعلق نہیں رہا، ہاؤس آف کامنس میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر "مسئلہ ہند" کے معنی "ہندو مسئلہ" کے ہیں، حالانکہ ملک کی ترقی و آزادی کی ذمہ داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی، تو اپنے تئیں بھولنے والو! تمہارے سر تو خدائے ذو الجلال کی طرف سے تھی

دنیا میں صداقت کے لیئے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے، بس تم تھے کہ تم کو خدا آگے کرنا چاہتا تھا، لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو، اور پھر اپنے آپ کو بھلایا، نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمھارے لئے جگہ نہیں

اکثریت کا خوف

ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیئے دل سے نکال دیجئے یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا، جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شئے قوموں کی معنوی قوت ہے۔ جو اس کے اخلاق اس کے کیریکٹر، اس کے اتحاد، اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیۃ الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے!! اسلام کی طاقت کبھی بھی وابستۂ دامِ قلت وکثرت نہیں رہی ہے، اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو، وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے۔ یہ تمام وساوس اس لیئے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں ہے، اگر روز اول ہی سے یہی ہو گیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین اعلیٰ کی طرف دیکھنے لگتے، تو اور کسی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور وہ تمام قوتیں جو آج باہمی جدال وقتال میں صرف ہو رہی ہیں، اس کے پیچھے صرف ہوتیں۔

بے توجہی سے نہ سنیئے کہ ایک بہت بڑا نکتۂ عمل کہہ رہا ہوں، اور اپنے طرز بیان کا شاکی ہوں کہ اسرار رموز کی باتیں بھی حسن وعشق کی کہانی بن جاتی ہے۔

اپنے سامنے ایک جاں ستاں جلوہ گاہ حسن پیدا کر لیجئے، پھر اگر آپ دوسری طرف دیکھنا چاہیں گے بھی تو نہیں دیکھ سکیں گے۔ آپ کی تمام بے راہ روی، نفس پرستی اغراض پسندی، باہمی جنگ و جدال، ایثار و فردیت فراموشی، اور ہر قسم کے اشغال ضلالت صرف اس لیئے ہیں کہ سامنے کوئی کشش نہیں، اور جس بلا کے عقل و ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں جس دن ایک اُٹھتی ہوئی نظر بھی "آزادی" کے حسن پر پڑگئی، پھر آپ خود بخود تمام قصے بھول جائینگے

مشکلاتِ راہ

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصب العین اپنے لئے تجویز کرنا چاہیئے، مگر مشکلاتِ راہ سے گھبراتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے، نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دہان کو کون بد مزہ کرے؟ لیکن اب ہم اُن سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے نیچے اُترا ہی نہیں۔ کسی طرح منہ بنا کر ایک جرعہ اُتار لیجئے، پھر پوچھیں گے کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

اے اخوان غفلت شعار، نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ مقتل سیاست ہے، یہ مشہد آزادی و حریت ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لئے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے، یہ آپ سے کس کمبخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھیئے؟ یہاں آئیگا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے، ہر لمحے مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں، حالانکہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال

در پیش ہے۔ یہاں ہوس پرستوں کا گذر نہیں، اس میدان کے مردوہ جان فروشان الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں۔

سیاست کی جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ چند تجویزیں گھڑ کر اور شکریہ کے سجدہ کرکے اپنے عیش کدوں میں چھپ جائیگا۔ اور وہ آسمان سے ڈھونڈتی ہوئی آپ کے سامنے آموجود ہوگی! آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ آئیے، لیکن آنے کا ارادہ ہے تو اپنے دل وجگر کی طاقت کو ٹٹول لیجئے۔

غلامی کے پتلے اور سیاست کی رُوح کا دعوٰے

آپ کے گذشتہ اعمال سیاست سامنے آجاتے ہیں، تو ہنسی بھی آتی ہے۔ اور رونا بھی آپ نے برسوں سیاست کے ساتھ جو تمسخر کیا ہے، اس کی نظیر شاید ہی کسی قوم کی ضلالت و گمراہی میں ملے ہر خوشامد و غلامی کی غلاظت کا کیڑا جس کا وجود اغراض پرستی کی کثافت سے متعفن ہوتا تھا، نکلتا تھا اور دعوی کرتا تھا کہ میں مرد میدان سیاست ہوں اور قوم کے پولٹیکل اعمال کا مصلح! جن عیش پرستوں کو کسی آزمائش میں پڑنے کی ہمت ایک طرف، اتنے کی بھی برداشت نہ تھی کہ گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی ذرا سی بے مہری بھی گوارہ ہو، اس کا دعوای ہوتا تھا کہ ہم قوم کے پولٹیکل کارزار اعمال کے سپہ سالار ہیں، اور نکلے ہیں تاکہ اس معرکے میں اپنی تلوار کے کاٹ دکھلائیں۔ اربابِ نظران ہوس پرستوں کو دیکھتے تھے ہنستے بھی تھے اور

زمانے کی بوالعجبی پر روتے بھی تھے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　　اب ابروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اسے بیخبر یاد رکھو کہ زندگی کی خواہش ہے تو مشکلات سے گھبرانا لاحاصل ہے۔ کیونکہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسانوں ہی کے لیئے ہیں ایک بے روح لاش کے لئے نہیں ہیں آرام کی خواہش ہے تو اس کی سب سے بہتر جگہ قبر ہے، بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی پر جب چلو گے تو ٹھوکریں کھانا ضروری ہیں۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں، اب خدا کے لیئے بستر مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھئے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں تک پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولیئے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ "مسلم" ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے۔ کب تک اس دین الہٰی کو اپنے اعمال سے شرمندہ کیجئے گا؟ کب تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسائیے گا، اور خود نہ رویئے گا؟ اور کب تک ہندوستان میں اسلام کی قوت کا خانہ خالی رہیگا؟ اگر مصائب کا تازیانہ غفلت کی ہوشیاری کا ذریعہ ہے تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نزول نہیں ہو چکا ہے۔

یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لیئے ملک کی آزادی کے لئے جدو جہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد

فی سبیل اللہ، آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے، جو حق اور صداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیئے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیئے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں، یقین کیجئے وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف، جس کے لیئے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا پس اُٹھ کھڑے ہو کر خدا اس کو اٹھانا چاہتا ہے، اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہوں بیدار ہوں، اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں، ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔

سرگذشت

جنوری ۱۹۲۰ء کو جب مجھے ۴ سال کے بعد نظر بندی سے رہا گیا، تو میں اپنی آئندہ زندگی، زندگی کے کاموں، اور کاموں کے طریق و اسلوب کی نسبت خالی الذہن نہ تھا، اور نہ اپنے ارادہ کے بہنے کے لیئے واقعات و حوادث کے کسی سیلاب کا منتظر تھا، میں نے ہمیشہ بہنے کی جگہ چلنے کی کوشش کی ہے اور اس وقت بھی اپنے سفر عمل کے لیئے ایک طے شدہ راہ اختیار کر چکا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا، کہ آئندہ مجھے کیا کرنا چاہیئے! اور میری مشغولیت کا عنوان و طریق کیا ہوگا؟

دنیا کے واقعات و حوادث طوفان کی طرح اُٹھتے اور سیلاب کی طرح

آتے ہیں اور انسان کا کمزور ارادہ ہمیشہ اس کی سطح پر حباب کی طرح بہتا رہتا ہے، حکمتِ الٰہی نے اگرچہ انسان کو یہ طاقت بخشی ہے کہ اس طوفان و سیلاب کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو فرشِ زمین کی طرح اس کی لہروں پر بھی چل سکتا ہے اور دنیا کبھی ان عزائم سے خالی نہیں رہی ہے جنھوں نے نہ صرف اس کا مقابلہ کیا ہے بلکہ مرکب کی طرح لگام لگا کر جس طرف چاہا ہے رُخ پھیر دیا ہے، لیکن افسوس کہ زندگی اور ارادہ کے اس کرّہ میں بہت کم انسان ہیں جو خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور اُن سے بھی کم ہیں جو سمجھنے کے بعد برت سکتے ہیں۔

زمین پر درختوں کے جھنڈ ہیں جو ہوا سے ہلتے ہیں، کنکر پتھر کے ڈھیر ہیں جن کو ٹھوکریں پامال کرتی ہیں، خس و خاشاک کے انبار ہیں جن کو آندھی اُڑا لیجاتی ہے، اسی طرح انسانوں کی بھی ٹولیاں اور بستیاں ہیں جو اگرچہ دیکھتا اور سنتا ہے، سوچتا اور ارادہ کرتا ہے، لیکن جب حوادث اُمنڈتے ہیں، واقعات و تغیرات بہنے لگتے ہیں تو وہ اپنی تمام ارادی اور ادراکی قوتوں کو خیرباد کہہ دیتا ہے، اور پھر درخت کی طرح گر کر، پتھر کی طرح لڑھک کر، خس و خاشاک طرح آناً فاناً بہہ جاتا ہے! مقامِ انسانیت کا منارہ بہت ہی بلند ہے لیکن اس کی دیواریں جمادات کی سطح ہی سے بلند ہوئی ہیں، اس لیئے اگر اس کی چوٹی گرے گی تو وہیں پہنچے گی جہاں سے بلند ہوئی تھی

۱۷ء سے ۱۹ء تک کے حوادث عالم کا سیلاب اگرچہ نہایت

مہیب اور ہوشربا تھا اور بہت مشکل تھا کہ ارادہ اور فیصلہ کی دیواریں اُس کے مقابلے میں قائم رہ سکتیں لیکن عنایت الٰہی کی دستگیری سے میں نے اپنے ارادہ اور عزم کو اُس وقت بھی پوری طرح قائم و استوار پایا اور ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل پر مایوسی کو قبضہ نہ ملا۔ واقعات کی المناکی اور ناکامی میرے دل و جگر کو چیر دے سکتی تھی اور حوادث کی غمگینی اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے سکتی تھی جو اُس کے ریشے ریشے میں بسا ہوا ہے اور صرف اُسی وقت نکل سکتا ہے جب دل بھی سینے سے نکل جائے۔ وہ زمین کی پیداوار نہیں ہے کہ زمین کی کوئی طاقت اُسے پامال کر سکے۔ وہ آسمان کی روح ہے جو آسمان کی بلندیوں ہی سے اُتری ہے۔ پس نہ تو زمین کی اُمیدیں اُسے پیدا کر سکتی ہیں، نہ زمین کی مایوسیاں اُسے ہلاک کر سکتی ہیں عین ۱۹۱۶ء کے اواخر عہد میں جبکہ اُمیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا اُلٹ چکی تھی، اور اُس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور شور کے ساتھ گزر چکا تھا تو میں رانچی کے گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیائے اُمید کی تعمیر کا سرو ساماں دیکھ رہا تھا اور گو دنیا نے دروازے کے بند ہونے کی صدائیں سُنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے۔

۱۹۱۸ء کے رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اُس کی بیدار و معمور راتیں تھیں جب میں نے انھیں ہاتھوں سے اُمیدوں اور ارادوں کے

نئے نقشوں پر لکیریں کھینچیں جن سے تمام پچھلے نقشے چاک کر چکا تھا۔

ہمتت نگر کہ صدرق و دفتر امید صد پارہ کردہ ایم و بہ خوناب شستہ ایم

جنوری سنہ ۲۰ء میں جب میں نظر بندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا تو دو سال پیشتر کا یہ نقشۂ عمل میرے سامنے تھا، اور اس لئے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا نہ مزید غور و فکر کا۔ بلکہ صرف شغل و عمل شروع کر دینا تھا میں نے آئندہ کے لئے جن امور کا ارادہ کیا تھا، اُن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ رہائی سے نکلتے ہی کسی گوشۂ عزلت میں رفقاء و طالبین کی ایک جماعت لیکر بیٹھ رہوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمت میں مشغول ہو جاؤں گا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیشِ نظر تھے، اُن کے لئے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی، قیام و استقرار ہی مطلوب تھا۔

چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد سیدھا کلکتہ کا قصد کیا اور اگرچہ تمام ملک سے پیام ہائے طلب آرہے تھے اور ہر طرف نظر بندوں کی رہائی کا ہنگامۂ تہنیت و تبریک گرم تھا لیکن میں کہیں نہ جا سکا اور سب سے عذر خواہ ہوا۔ میری طبیعت و جستجو نے مجھے مہلت نہ دی کہ اپنے وجود کو لوگوں کی طلب و جستجو کا سراغ بنا سکوں۔

لیکن عرفت ربی بفسخ العزائم۔ بالآخر مجھے سیلاب میں بہنا ہی پڑا۔

مگر الحمد للہ کہ یہ حوادث و واقعات کے سیلاب کی مخالفانہ رو نہ تھی جو عزم کو بہا لیجاتی اور قصد کو تاراج کر دیتی ہے، بلکہ خود عزم و عمل ہی ایک رو تھی جس کے اندر سے مشیئتِ الٰہی کی صدا اٹھتی ہے اور انسان کو اس کے فیصلہ کی جگہ اپنے فیصلہ کی طرف بلاتی ہے ۔ میں نے جنوری ۲۲ء کے آخر تک پوری جدوجہد کی کہ موجودہ تحریک کی خدمات کو اس عنوان سے انجام دوں کہ میرا قرارداد اسلوب عمل بھی قائم رہے اور اقلاً سیر و گردش کے کاموں سے الگ رہوں لیکن حالات کی نزاکت، مقاصد کی ناگزیر احتیاجات اور اشخاص کے فقدان نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہ دیا، کچھ عرصہ تک کشمکش جاری رہی اور بالآخر مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت اور ضرورت نے کر دیا ہے اور اب تمام تر اسی کے لیئے وقف ہو جانا ہے، اس حالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری ۲۰ء سے اس وقت کا زمانہ جو ۱۸ ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے پے در پے دوروں اور عام تحریک کی فکروں اور کاوشوں میں بسر ہو گیا، اور تمام تر دوسرے مشغلے یک قلم دور کر دینے پڑے ۔ نہ تصنیف و تالیف کی تکمیل ہو سکی، نہ طباعت و اشاعت کی فکر کر سکا، نہ البلاغ جاری کیا جا سکا، نہ اپنے پیش نظر مہمات کا پوری دلجمعی کے ساتھ انجام پا سکے ۔ ساری باتیں قیام و سکون پر موقوف ہیں اور وہ ان ۱۸ مہینوں میں ایک شب و روز کے لئے بھی میسر نہ آسکا ۔ زندگی وہی زندگی ہے جو سب کے لئے مقدر ہوئی ہے وقت وہی شب و روز کا

وقت ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے نہ سورج میرے لئے زیادہ دیر تک ٹھہر سکتا ہے نہ رات میری خاطر اپنا معمول بدل دے سکتی ہے۔ ایک زندگی ہے لیکن سینکڑوں زندگیوں کا حوصلہ دل میں پنہاں ہے۔ کیونکر دنیا کو پلٹ دوں؟ اور کہاں سے اُس طاقت کو بلالوں جو ایک دل و دماغ کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں ہاتھوں کو جوڑ دے!

کمند کوتہ و بازوئے سُست و بام بلند بہ من حوالہ و نومیدیم گمان گیرند

موجودہ حالت یہ ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ حالت کب تک رہیگی۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

لیکن اس حالت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ موجودہ تحریک کے قیام استواری کے لیئے جس دعوت و تبلیغ اور ہدایت و تعلیم کی ضرورت تھی، اُس کا کوئی باقاعدہ اور صحیح انتظام نہ ہو سکا۔ فی الحقیقت الہلال اور البلاغ کی ضرورت جس قدر اس وقت تھی جبکہ تخم ریزی کا موسم تھا اس سے کہیں زیادہ اب ہے جبکہ آبیاری و نگہبانی کا وقت آگیا ہے، ضرورت اس بات کی تھی کہ ابتدا سے تحریر و اشاعت کا کوئی ایسا سلسلہ جاری رہتا جو ہمیشہ تحریک خلافت کے لیئے مشورہ و ہدایت بہم پہنچاتا اور ہر طرح کی غلطیوں اور لغزشوں سے کارکنوں کو متنبہ کرتا رہتا۔ نیز مخالفین و متشککین و ضعفا عفریت کے شکوک و شبہات کا بھی بر وقت ازالہ ہوتا رہتا۔ گزشتہ سال اسی ضرورت کی بنا پر مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے شعبۂ تبلیغ و اشاعت قائم کیا گیا اور رسالہ

"خلافت و جزیرۃ العرب" کی تصنیف و اشاعت عمل میں آئی۔ ارادہ تھا کہ اشاعت کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ لیکن پھر وہی موانع سدِّ راہ ہو گئے جو میری تمام مشغولیتوں کے لئے ہو چکے ہیں اور کسی ایک مقام پر نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا سلسلہ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

میں اس موقع پر ضرورت کی زیادہ تشریح نہ کروں گا کیونکہ وہ اس قدر واضح ہے کہ حاجت تفصیل نہیں۔ سفر شروع ہو چکا ہے۔ قدم سفر سے نا آشنا نہیں رہے ہیں لیکن راہ و رسم و سفر و منازل و مواقع راہ سے اب تک بےخبری چھائی ہوئی ہے اور اس لئے قدم قدم پر لغزشیں ہو رہی ہیں اور طرح طرح کی حیرانیاں پیش آ رہی ہیں۔ اس حالت کا صحیح اندازہ اُن بے شمار خطوط سے ہو سکتا ہے جو ہر گوشۂ ملک سے ہمیشہ آتے رہتے ہیں اور جن کا فرداً فرداً اور بار بار جواب دینا میری طاقت سے باہر ہو گیا ہے۔

بحالت موجودہ یہ بات تو میری طاقت سے باہر ہے کہ الہلال و البلاغ کے درجہ کا کوئی رسالہ جاری کر دوں کیونکہ جب تک موجودہ تحریک کی مشغولیت سے مہلت نہ ملے، اس کیلئے وقت نہیں نکال سکتا اور نہ اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ کسی پرچہ اور اخبار کو براہ راست خود مرتب کر سکوں گا۔ علی الخصوص ایسی حالت میں تمام تر وقت سیر و سفر میں بسر ہو رہا ہو۔ اور ابھی لوگ اس درجہ نظم و انضباط کے عادی نہیں ہوئے ہیں کہ کارکنوں کو سفر کی حالت میں بھی حفظ معمولات اور معمولات کی دعوت دے سکیں۔

پس اگر بحالت موجودہ اس ضرورت کا کوئی علاج میرے اختیار
میں تھا تو وہ یہی تھا کہ دیگر اہل قلم کے زیر اہتمام ایک رسالہ جاری ہوجاتا
مسلک و مشرب کی نگرانی میرے ذمہ رہتی، اور جس قدر بھی فرصت ہاتھ
آتی وقت کے ضروری مسائل و مقامات پر میری تحریرات وقتاً فوقتاً اس
اس میں شائع ہوتی رہتیں۔

چنانچہ اسی غرض سے پیغام جاری کیا جاتا ہے اور امید ہے
کہ جن احباب نے اس کی ترتیب و اہتمام کا بار اٹھایا ہے، ان کی سعی
وقت کی ایک سب سے بڑی ضرورت کے لیئے مقبول و مشکور ہوگی۔

آخری منزل

ہم نے آخری منزل کا بار بار ذکر کیا ہے۔ وہ ہمارے سفر کا مقصود
ہے، طلب و سعی کا مطلوب ہے، جستجو کا سراغ ہے، آرزوؤں اور تمناؤں
کی امیدگاہ ہے!

پھر کیا وہ آگئی؟

اگر واقعی آگئی ہے اور واقعی ملک اس کے استقبال کے لیئے
تیار ہے تو ہماری کامیابی بھی آگئی، اور فتح و مراد نے بھی اپنے چہرے سے
نقاب الٹ دیا!

ہم نے اول دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کے لیئے

آخری منزل قید خانہ ہے اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا۔ قید خانوں کی کوٹھریوں میں ہوگا۔ ہم نے اسی لیئے سول ڈسلو بیڈینس یعنی سول قانون کی نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا کیونکہ قید خانہ کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ وہی ہے پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آگیا ہے۔

دو سفر

سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا۔ اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کیئے جائیں، یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لیئے قربان کردیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کردیا، تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہنچ گیا اور وہ کامیاب ہوگئے۔ اب ان کے لیئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں؟ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے، اور اس کے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا، اس نے اپنا کام پورا کردیا یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں ایک ہی ہیں۔

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہوجائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے، جو بیج بوتا ہے، خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروان مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہوکر رہیگا۔

ہندوستان کاسفر اور آخری منزل

ہندوستان نے بھی سفر شروع کیا، ایک سفر اس کے مقاصد کا ہے، ایک سفر جاں دادگان مقاصد کے فرائض کا ہے اور پہلے کی کامیابی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہے۔ طریق عمل یہ قرار پایا کہ جو سفر اس وقت تک چند مسافروں میں محدود تھا اس کو تمام ملک اپنا شیوہ بنالے اور سیکڑوں ہزاروں جانباز ایسے پیدا ہو جائیں جو کامل خود فروشی اور قربانی کے ساتھ کوچ کر دیں۔ ایمان کی لازوال روح ان کے دلوں میں ہو، صبر کی انتھک اور اٹل طاقت اُن کے قدموں میں، عشق اُن کی رہبری کرے، شوق اُن کا رفیق و دمساز ہو عزم قدم قدم پر ہمت بڑھائے۔ اور ہمت آگے بڑھ کر راہ صاف کرے اور پھر جب آخری منزل آجائے۔ قید و بند کی پکار ہو اور طوق و زنجیر استقبال کریں۔ تو ایسا ہو کہ ہزاروں قدم اُس کے لیئے مضطربانہ دوڑیں، ہزاروں ہاتھ اُس کی طرف والہانہ بڑھیں، ہزاروں دل اُس کی طلب و شوق سے معمور ہو جائیں، وہ عیش و نشاط کی پکار ہو، کامرانی و مراد کی بخشش ہو، فتح و اقبال کا نشان ہو ہر انسان اُس کے لیئے آرزو میں کرے، ہر دل اُس کے لئے رشک کھائے، اور ہر روح میں اس کے لئے بیقراری سما جائے۔ قید کرنے والے قید کرتے کرتے تھک جائیں، لیکن قید ہونے والے

قید ہونے سے نہ اکتائیں، ہتھکڑی پہنانے کے لئے ہاتھ نہ ملیں لیکن ہتھکڑی پہننے والے ہاتھوں کی کمی نہ ہو یہاں تک کہ ہندوستان کے جیلخانوں میں ایک نئی بستی زندانیان حق کی آباد ہو جائے اور اُس کی کوٹھریوں اور محنت خانوں میں چوروں اور ڈاکوؤں کے رکھنے کی جگہ باقی نہ رہے۔

آخری منزل کے بعد جب ملک قربانی اور سرفروشی کا یہ جذبہ طے کر لیگا تو پھر اُس کی طاقت ناقابل تسخیر ہو جائیگی کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کرے گا، کوئی فوج اُس کو فتح نہ کر سکے گی، آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اُتر آئیں اور سمندر کی تمام فوجیں بھی اکھٹی ہو جائیں جب بھی قربانی کی قہرمان طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کو قید کے نام سے دھمکایا جا سکتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے لیکن جو انسان خود قید کا آرزومند اور موت سے بیخوف ہو اُس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے؟

بالآخر یا تو گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اُترنا ہوگا اور حق و انصاف کے ساتھ جھکنا پڑے گا یا ہمیشہ کے لیئے اُسے تخت ہی چھوڑ دینا پڑیگا۔

آخری منزل کیلئے تین شرطیں لیکن اس منزل کا نقشہ لفظوں میں جس قدر جلد کھنچ گیا عمل میں اس قدر آسان نہیں ہے کہ ایک ایسی حرکت کیلئے جو کروڑوں غفلت پسند انسانوں میں پھیلی ہوئی ہو بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے اور جب تک خود ہمارے دلوں کا کام پورا نہ ہو جائے میدان کا کام شروع

نہیں ہو سکتا۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ملک میں کامل قربانی، استقامت اور نظم پیدا ہو جائے قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے خود فروش تیار ہو جائیں جو کامل ایمان و یقین کے ساتھ سچائی کے ہاتھ بک چکے ہوں۔

استقامت سے مقصود یہ ہے کہ اُن کا جذبہ عارضی و ہنگامی نہ ہو۔ بلکہ اُس میں پوری طرح قرار و جماؤ پیدا ہو جائے۔ اُن کی آگ ہوا سے بھڑکائی جائے لیکن پھر دم بدم ہوا کی محتاج نہ رہے۔ خود جو شلے میں بھی مشتعل رہنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ وہ سمندر کی طرح لبریز ہو جائیں۔ پہاڑ کی طرح خود اپنے سہارے کھڑے ہو جائیں۔ قرآنِ حکیم نے بتلایا ہے کہ کامیابی اور بے خوفی کے فرشتے صرف اُن ہی پر اُترتے ہیں جو خدا پرستی کے ساتھ استقامت کا جماؤ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔

نظم سب سے بڑی شرط ہے اور وہ آخری بھی ہے، اور پہلی بھی ہے، کائنات کا پورا کارخانہ اسی کی طاقت پر چل رہا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ عمل کا تمام حلقہ ایک رشتہ میں منسلک ہو جائے، کوئی کڑی اس سے باہر نہ جانے پائے جو راہ قرار دی جائے سب اُسی پر گامزن رہیں اور سارا حلقہ اس انتظام اور یکسانیت کے ساتھ کام کرے۔ گویا سب کے دل اور جذبات ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ نظم لوگوں میں پورا پورا ضبط اور اپنے اوپر قابو رکھنے کا ملکہ پیدا کر دے، اشتعال ان کو ہلا نہ سکے، اور غیظ و غضب ان پر قابو نہ پا سکے۔ وہ وقت پر بھڑک نہ اٹھیں، بیجا جوش میں آکر اپنا کام فراموش نہ کردیں۔ قید و بند کے یہی معنی ہیں کہ ہم قید ہوں، قربانی و خود فروشی کے یہی معنی ہیں کہ ہم ہر طرح کی تکلیف اور نقصان برداشت کریں۔ پس اگر ایسا ہونے لگا تو اچنبھا کیوں ہو؟ غصہ کیوں آئے؟ انتقام کا ارادہ کیوں کریں؟ کیوں بچنا چاہیں؟ اور کیوں دوسروں کو بچائیں، پیاسا پانی سے نہیں بھاگتا اور مفلس نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ دولت ملنے پر لڑنے لگا ہو۔ اگر ہم واقعی راہ حق میں قید ہو جانے کے لیئے تیار ہیں اور سچ مچ ہمارے دل کا یقین یہی ہے کہ اس منزل سے ہو کر کامیابی تک پہونچیں گے تو پھر ہمارا مطلوب و مقصود یہی ہونا چاہیئے۔ اور اگر مقصود ملنے کی راہ کھل گئی تو ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینا چاہیئے۔ ایسا کیوں ہو کہ ہم بھاگیں اور بے قابو ہو کر لڑنے پر اتر آئیں؟

یہ شرط سب سے بڑی اور نازک شرط ہے اور اس عمل کی ساری کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ اگر یہ طاقت ملک میں پیدا نہ ہوئی تو پھر اس کی قربانی اور استقامت کچھ بھی سودمند نہ ہوگی۔ فوج کتنی ہی بہادر اور جانباز ہو لیکن اگر اس میں نظم و استطاعت نہیں ہے تو اس کی شجاعت و جانبازی یک قلم رائیگاں جائیگی۔ کم از کم ملک میں بکثرت ایسے کارکن مہیا ہو جانے

چاہئیں جو وقت پر لوگوں کے جذبات مسخر کر سکیں اور اشتعال اور بے راہ روی پر پوری طرح قابو پالیں۔

ہم اپنی کمزوریوں کا اقرار کرتے رہے ہیں۔ ہم معترف ہیں کہ ملک نے ابھی یہ شرطیں پوری نہیں کیں۔ بلا شبہہ قربانی کا ولولہ زندہ ہوگیا ہے لیکن استقامت کا امتحان باقی ہے، اور نظم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا چونکہ ہم مطمئن نہ تھے اس لئے آخری منزل کا اعلان نہ کر سکے اور بار بار ملک سے یہی درخواست کی، کہ درمیانی منزلوں کو پہلے کامیابی کے ساتھ طے کرے

کانپور کا دردناک نظارہ

زمین پیاسی ہے، اُس کو خون چاہیئے، لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصلے کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا؟ مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور پر یہ خون برسا۔ اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش و خروش میں ہے، اپنی قربانگاہ کے لئے نذر مانگتی ہے، کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے

صوبہ متحدہ کا بادشاہ (سرجیمس مسٹن) بالآخر بادشاہ آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا۔ جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی!

مسلم ہستی تو اب کہاں بسیگی؟ کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے، لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے، وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تند و تیز ہوا کو روک دیتا ہے، تو غیض و غضب کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے، کیا تو ہمارے شدائد و مصائب کا طوفان نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے حزن و غم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا؟

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا، لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا، لیکن کیا اس سے بھی کم، جتنا ایک راستے کی زینت و آرائش کا؟

۳ راگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے، بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف و ناتواں و غیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے، انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل و

انصاف کو زخمی کر رہی ہیں؟ انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومتِ برطانیہ کی عمارت قائم ہے! وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں۔۔ نادانو! تم اس سے عداوت کر رہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔

غیر آئینی خونریزی

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، با چشمِ و نم و با دل پر غم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بیکسی کا نشان تھا، کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ، چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی، اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم و اسمٰعیل کی زبان پر جاری تھی۔

یہ پر اثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہو جاتی ہے اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب چاک ہو جاتا ہے میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں، جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں، جو افسوس دم توڑ چکیں۔

گورنمنٹ پریس کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں ۱۴ لاشیں تھیں، پھر بتاتا ہے ۱۸ تھیں، عقیدت منددل اس کو تسلیم کرتا ہے

لیکن عقل و محبت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں ۱۰، ۱۵ ہزار آدمیوں کا مجمع ہے، پولیس بے محابا ۱۰ منٹ تک بے پروائی سے اُن پر گولیاں برساتی ہے، ہر گولی ایک دور کے فاصلے تک پھیلتی ہے اور صرف ۱۸ لاشیں اُن کے صدمہ سے گر پڑتی ہیں، مسلمان اپنی روئیں تنی کا دعویٰ کرتے ہیں، اُن کو مسرور ہونا چاہیئے کہ گورنمنٹ پریس بھی اُن کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہے۔

حکومت قانون کے ماتحت ہے، لیکن افسوس ہم زبان کے ماتحت ہیں، ہم پر گورنمنٹ کا قانون حکومت نہیں کرتا، ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہے ایک ضعیف و کمزور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلۂ ضرر نہیں، جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا، جو کسی جائداد و عزت پر حملہ نہیں کرتا، صرف ایک جنبش لب سے آغشتہ خاک و خون ہو جاتا ہے بے شبہہ وہ قانون کی مخالفت کرتا تھا، لیکن اُس کی تادیب کے لیئے عدالت کے کمرے، اور قید خانوں کی کوٹھریاں تھیں، سنگین کی نوکیں، اور بندوقوں کی گولیاں نہ تھیں۔ برٹش مؤرخ ہم کو بتا سکتا ہے کہ برسٹل اور منچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں آتشبار ہتھیاروں سے کام لیا گیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دے گا کہ برسٹل اور کانپور میں کتنی مسافت ہے؟ لیکن اے معصوم مؤرخ! ایرائے خدا ہمیں بتا ناکہ برسٹل اور کانپور کی ذی روح حقیقتوں میں کتنا فصل ہے؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں، لیکن اے مقدس نصرانی! پیغمبر ناصرہ کے لئے بتا کیا تیرا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں روح نہیں۔ ہاں روح ہے لیکن تو نے ان کو بے جان کر دیا، کیا تجکو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ تو "خون مت کر"

اسباب شورش

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہے کہ "معاملۂ انہدام مسجد کے لئے مسلمانان کانپور میں کوئی جوش نہیں صرف بیرونی مسلمان کو جوش ہے" واقعۂ قتل عام سے پہلے بھی یہ غلط تھا، کہ اگر یہ سچ تھا، تو مسلح سپاہی وقت انہدام مسجد کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبت ناک نظاروں سے کن کن کو ڈرایا جا رہا تھا؟ اور اب تو حکومت صوبہ متحدہ کو خود نظر آ رہا ہو گا کہ لوازم تدبر و سیاست سے اس کا خزینۂ حکومت کس قدر رہی تھا۔

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہے کہ مسلمانان کانپور کا جوش جرائد اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہے، لیکن وہ کون تھا، جس نے مسلمانوں کو طعنہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے جوش و غیرت کی حقیقت صرف چند الفاظ ہیں؟ صوبہ کا نیم سرکاری اخبار "پائینیر" اور پھر وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کا جولانگاہ صرف قلم کا میدان ہے؟ شہنشاہی انگلستان کی نیم سرکاری زبان ٹائمز۔

سر جیمس مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا، اور اُن کے اس جوشِ دینی اور ولولۂ اسلامی کو جھوٹا کہا جو ۱۳۰۰ برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے اُن زیرِ خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن رہے سر جیمس مسٹن کے یقین کے لئے دلیل چاہیئے تھی۔ فرزندانِ اسلام بڑھے اور انھوں نے مقتل عام میں جاکر جسمانی پردہ جو فرمانروائے صوبہ کے سامنے حائل تھا، اُلٹ دیا، اور دنیا کو نظر آگیا کہ درحقیقت اس پردہ کے پیچھے سُرخ انگارے تھے جو خود دوسروں کو نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا۔

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لئے کبھی اور دلیل کے طالب ہیں، اگر حقیقت میں اُن کی طلب صادق ہے، اور اُن کی کوشش کامل ہے۔ تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے جو اسیرانِ مدافعت ملی کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں انھیں خبردار رہنا چاہیئے کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبہ متحدہ کا طرزِ حکومت اُسی وقت ایک خونین منظر کا اشارہ کر رہا تھا جب اُس کا فرمانروا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی گڑھ) میں اور دوسری طرف مقامی دربار (گورکھپور) میں ایک اسپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اُس نے دھمکی دی تھی کہ بزور اس جوش کو فرو کردوں گا

آنر ۳ر اگست کو اُس وقت جبکہ وہ بریلی میں تھا اور ایک مسلمان ریاست (رامپور) اُس کا خیر مقدم کررہی تھی اُس نے بزور اس جوش کو فرو کردیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول ومجروح ہوئے، کہ یہ اُن کی خصوصیت ملی ہے، ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ مسجد خلیل کی بقائے حرمت کے لئے سرکبف ہیں، لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کررہی تھی اُس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہوگئی؟

روز حزن و ملال ملی شہدائے کانپور کی یاد ہمارے دل میں ہر وقت تازہ رہیگی، ہم اُن کی برسی منائیں گے، ہم اُن کا مرثیہ پڑھیں گے، ہم ان کی مظلومی وبیکسی کو ہر وقت یاد رکھیں گے، ہم اُن کے جوش حمایت دینی و مدافعت ملی کو روئیں گے، ہم آئندہ سے ۳ر اگست کی صبح کو، ۱۰ محرم کی دوپہر سمجھیں گے کہ یہ ہماری مظلومیت کی پہلی قسط تھی۔

۴ر اگست کی صبح کو ہز آنر لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ اسپیشل ٹرین سے کانپور پہنچکر پہلے قتل گاہ تشریف لائے جہاں انھوں نے دیکھا ہوگا کہ صرف انسانی ضد اور غلط کاری نے جو گورنمنٹ کے منشار قانونی کے بالکل غیر مطابق تھی، اُس دیوار کے پیچھے جہاں چند روز پہلے تیشوں نے ایک معبد اسلام کی بیحرمتی کی تھی، پرستاران دین حنیف ایک ایک اینٹ

کو اپنے خون کا سُرخ کفن پہنا رہے تھے کہ اُس کی ہر اینٹ دین توحید کی ایک ایک سر و لاش تھی۔ اُنھوں نے اپنے گرم خون کے چھینٹے دیئے کہ ان بیجان لاشوں میں حرکت پیدا ہو، حرکت پیدا ہوئی اور اُس نے تمام ہندوستان کو لرزا دیا۔

ہندوستان لرزتا ہے، کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے، کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے کون ہے جو اُس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو؟

مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم معفور تھے، ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے؟ لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہ ملا، گولیوں اور بندوقوں کے قطع و برید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے، غزوۂ بنی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں، ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اخفائے راز کے لئے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوان الٰہی اُن کا منتظر تھا۔

مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں! اینٹوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے؟ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں؟ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے؟ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے

کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق اُلٹ گیا۔

معصوم بچو! اور ریاض اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا؟ سر جیمس مسٹن کے الفاظ طعن سے نے تمہیں بے گناہ و نا آشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا، تم بڑھے کہ اپنے دہن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو، اے طائران قدس! اُڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبارات کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لئے تنبیہ و عبرت نہ تھی، قدرت نے خون کی سرخ تحریروں میں ہمیں نامۂ عبرت و دستور تنبیہ بھیجا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اُس سے تنبیہ و عبرت حاصل کی

کانپور کا واقعہ کانپور کا نہیں رہا بلکہ وہ دنیائے اسلام کا واقعہ ہے مسلمانان عالم نے ہر گوشہ سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کی آغشتہ خون اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا، ہم شرمندہ تھے کہ ہمارے پاس اُن کے تحفہ کے لیئے جو سامان تھا، اُس میں خون کے قطرے نہ تھے، اب ہم شرمندہ نہیں، اے مسلمانان عالم! ہمارے بہے ہوئے خون، کٹی ہوئی رگوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا ہدیہ قبول کرو۔

قتل و غارت کا ہولناک منظر

موت اور ہلاکت کے وہ اوقاتِ الیمہ جو خون کی رگوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سے انسان کی جانوں کو کھینچ لیتے ہیں اور آبادیاں اجاڑ اور زندگیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ وہ ارواح حروب وقتال جو زندگی کے لئے موت کا اور آبادی کے لئے ویرانے کا دروازہ ایسی عجلت اور ایسی آسانی سے کھول دیتی ہیں، گویا کسی لپٹے ہوئے بند کو کھول دیا گیا۔ وہ ہلاکت اور موت کی عظیم الشان ہستیاں جن پر انسان پاش توپیں لدی ہوئی ہیں اور آگ اور خون کے خونخوار درندے سوار ہیں، اور جو سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لیجانا چاہتی ہیں تا اپنے شئون و امور کی تدبیر کریں، ان سب کی چھائی ہیبت اور پھیلی ہوئی وحشت کی قسم، اور ان سب کی پھیلائی ہوئی موت اور برسائی ہوئی ہلاکت کی گواہی، کہ ارض الٰہی کا امن ڈوب گیا، انسانیت کی بستی اجاڑ ہو گئی، نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا، اور دنیا مثل اس بیوہ کے ہو گئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا ہو اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے لٹے ہوئے سنگار پر ماتم کریگی، اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دیگی۔ کیونکہ اس کا حسن زخمی ہو گیا، کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا اور اس لئے کہ اس کے فرزندوں نے اس پر تلوار اٹھائی اور اس لئے کہ اس کے دوستوں نے اسے کچل دیا۔ پس زندگی کی جگہ موت، عیش و سلامتی کی جگہ اضطراب

نغمۂ نشاط کی جگہ شور ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی، آب زندگی کی جگہ بحر خونیں، بستیوں کی جگہ قبریں، اور زندگی کے کاروبار، اور بازاروں کی چہل پہل کی جگہ موت کے وہ جنگل جن میں لاشیں سڑینگی، اور ہولناک سمندروں کے وہ خونی طوفان جن میں انسان کی لاشیں مچھلیاں اچھلیں گی۔ اور اے دنیا کے بڑے بڑے مغرور شہروں کے بسنے والو! کل تک تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا، تا زندگی پر گھمنڈ اور طاقت پر مغرور رہو۔ پر آج تم موت کے کھلونے ہو جنھیں بگاڑ دیا جائیگا، اور ہلاکت کی مورتیں ہو جنھیں مٹا دیا جائیگا۔ اور پھر اے وہ کہ تمدن کی بہشت، علم کے مرغزار اور عیش و نشاط زندگی کے حیرت آباد اور انجوبہ زار تھے، تم کل تک دوسروں کی موت و ہلاکت کی خبریں سنتے تھے، پر آج تمہاری ہلاکت کی خبریں پڑھی جائیں گی۔ کل تک تمہارے پاس کرۂ ارضی کی مصیبتوں کا قلم تھا، پر آج تمہاری مصیبتوں کی تاریخیں مدون ہوں گی، تم کل تک دوسروں پر ظلم و قہر کرتے تھے پر آج تم پر ظلم کیا جائیگا تم کل تک دوسروں کے لیئے آگ سلگاتے تھے، پر آج تمہارے لئے جہنم بھڑک رہی ہے تم کل تک ضعیفوں اور ناتوانوں کے لیئے درندے تھے، پر آج درندوں میں خود چل گئی اور بھیڑیوں نے آپس میں ایک دوسرے پر پنجہ مارا۔ تم کل کل تک دنیا کے لیئے موت کی بجلی اور ہلاکت کی بدلی تھے، پر آج کوئی نہیں جو تمہیں ہلاکت کی بارش اور بربادی کے رعد و برق سے بچا سکے۔ کل مشرق کی بربادیوں کا تم نے تماشا دیکھا، آج وہ تمہاری ہلاکت کو دیکھ رہا ہے۔

ماتمِ انسانیت

انسان کی سوئی ہوئی سبعیت و بہیمیت پھر جاگ اٹھی ہے وہ اشرف المخلوقات کی صورت سے آدمی مگر خواہشوں میں کہ

بھیڑیا، محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ، اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات، مگر اپنی روح بہیمی میں دنیا کا سب سے زیادہ خونخوار جانور ہے، اب اپنی خونریزی کی انتہائی شکل اور اپنی مردم خواری کے سب سے زیادہ بڑے وقت میں آگیا ہے۔ وہ کل تک اپنی کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا، پر آج چیتے کی کھال اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیئے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ نیک ہیں۔ درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن و راحت ملیگی، مگر اب انسانوں کی بستیاں اور اولاد آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہو گئی ہیں۔ کیونکہ وہ جو خدا کی زمین پر سب سے اچھا اور سب سے بڑھ کر تھا، اگر سب سے برا اور سب سے کمتر ہو جائے تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی اور نیک نہ تھا، ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی برا بھی نہیں ہو سکتا۔

شیر خونخوار ہے، مگر غیروں کے لئے۔ سانپ زہریلا ہے مگر دوسروں کے لئے، چیتا درندہ ہے، مگر اپنے سے کمتر جانوروں کے لئے، لیکن انسان دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق، خود اپنے ہی ہمجنسوں کا خون بہاتا اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لئے درندہ خونخوار ہے۔

پھر اس سے بڑھکر خسران و نقصان کیا ہوگا جس میں آج دنیا مبتلا ہے

وہ دنیا جس نے قوتوں کی صیقل کی، جس نے فطرت کے قوانین مستورہ کو بے نقاب کیا، جس کے عقل و ادراک کے خزانے کھلوا دیئے، جس نے ارتقائے فکر و علوئے مدرکہ سے دنیا کو علم کا گھر اور دریافتوں اور تحقیقوں کی مملکت بنا دیا، جو علم و مدنیت کے انتہائے عروج سے متوالی ہوگئی۔ جو قوتوں کے حصول کے نشہ سے بدمست ہو کر مغرورانہ جھومنے لگی، جس نے کہا کہ انسان کے سوا کچھ نہیں، اور جس نے اعلان کیا کہ مادہ کے اوپر کوئی نہیں۔ کیا آج اس کا یہ علم اعلیٰ، مدنیت عظمیٰ، یہ ایجادوں کا ڈھیر، یہ مخترعات کا انبار، یہ بیشمار کتابوں کی جلدیں اور یہ لاتعد و لاتحصیٰ، دماغوں کے افکا عالیہ و مدنیہ، ایک لمحہ، ایک دقیقہ کے لئے بھی اس ہولناک بربادی، اس خوفناک تصادم، اس وحشت انگیز خونخواری، اس خون کا سمندر بہانے والی اور لاشوں سے جنگلوں کو بھر دینے والی جنگ کو روک سکتے ہیں اور نوع انسانی کو عالمگیر نقصان و ہلاکت سے بچا سکتے ہیں؟ کیا قانون کشش ثقل جس پر نئے علم کو ناز ہے اس سے بچا لیگا؟ کیا قوت برقی کا کشف اسے روک دے گا؟ کیا بھاپ اور اسٹیم کی ایجاد کچھ سفارش کر سکے گی اور انسان کو غمگینی سے بچا لیگی؟ آہ یہ ایجادات محیرہ یہ مخترعات مدہشہ، یہ محدثات منورہ، جس پر مدنیت کو ناز اور علم انسانی کو غرہ ہے، امن و سلامتی کی جگہ خود ہی ہلاکت اور بربادی کا وسیلہ، اور خون اور آگ کی افزائش و تضاعف کا ذریعہ ہیں۔ اگر پہلے دنیا کے لئے صرف کمان کا تیر اور تلوار کی دھار تھی، تو آج تمدن کی بدولت ایک سکینڈ

میں کئی کئی مرتبہ چھوٹنے والے ہلاکت بار گولے اور بموں اور منٹوں سے اندر شہروں اور قلعوں کو مسمار کر دینے والے آہن پوش جہاز ہیں۔ پھر اے علم و مدنیۃ کے شیطان کیا تو اس لیئے آیا تھا کہ خدا کی آبادی کی ویرانی کو دوگنا اور اُس کی ہلاکت کے آلات کو زیادہ مہلک اور لاعلاج بنا دے؟ اور اے انسان کی غفلت اور اے اولاد آدم کی نادانی! تو کب تک خدا سے لڑے گی، اور کب تک اس کی زمین کے امن و راحت کو روکیگی؟ حالانکہ تمدن اور علم تجھے قوی بنا سکتا ہے پر نیک نہیں بنا سکتا؟

رستخیز تصادم

اور دیکھو یہ کیسی آگ ہے جو بھڑک اٹھی ہے اور کس طرح تمدن کی حسین و جمیل آبادیاں آگ اور دھوئیں کی ہولناکی کے اندر ویران ہو رہی ہیں۔

یہ دنیا کی مغرور اور فتمند طاقتوں کی ٹکر ہے، اور اتنی بڑی انسانی درندوں کی لڑائی جتنے بڑے خونخوار سباع و بہائم آج تک کرۂ ارضی پر پیدا نہیں ہوئے۔ دنیا نے ٹیٹس کے قصے سُنے ہیں جس نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ دنیا نے بخت نصر کو دیکھا ہے جو بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے بابل لے گیا، دنیا میں ایرانیوں کے قہر و استیلا کے افسانے سُنے گئے ہیں، جنھوں نے بابل کو مسمار کر دیا تھا اور رومیوں کے عہد تسلط و عروج کے ایسے بہت سے فاتح خونریزوں کی روائتیں محفوظ رکھی گئیں ہیں جنھوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقوں کو بہت ستایا اور اس کی زمین پر

بہت فساد کیا۔

لیکن خوں بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے، اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی اشد شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں، مگر نہ تو ایسی درندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا، جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے، اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں، پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے، اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرور طاقت سے جھوم رہی ہے۔ اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں، اس بھیڑیئے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے چنگھاڑتا ہوا اٹھا ہے، اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور روسو کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لئے پلا ہے! یہ کیسے مہیب ہیں؟ یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں؟ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارضی کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا؟ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی بھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غضب جو اب تک کبھی بھی زمین پر نازل نہ ہوا۔

متمدن قوموں کا غرور حد تک پہنچ چکا ہے، طاقتوں اور عجیب عجیب ترقیوں نے انھیں متوالا کر دیا ہے۔ اُن کو حسب سُننِ الٰہیہ زمین کی حفاظت کا منصب دیا گیا۔ لیکن اُنھوں نے قوت پا کر جنگ و فساد کی راہ اختیار کی اور طغیان و عصیان سے ارضِ الٰہی کو بھر دیا۔

پس ضرور تھا کہ غرور و طغیان کے لئے کوئی حد ہوتی، عجیب نہیں کہ مہلت ختم ہو گئی ہو، اور اچنبھا نہیں اگر ارضِ الٰہی کے امن کے لئے، بندگانِ خدا کی راحت کے لئے، اور کمزوروں کو سکھ کی نیند سلانے کے لئے اُن کا خون انہی کے ہاتھوں بہایا، اور اس طرح عدالتِ الٰہی اُن قوتوں کا حساب لے جو صدیوں سے تمام دنیا کے اعمال کا حساب لے رہے ہیں

یورپ کا تمدن، اُس کی طاقت، اُس کا جنگی اقتدار، اُس کے عجیب عجیب اسلحہ، اور بربادکن ہولناکیاں، اس کے ہیبت جہاز، اور کئی کروڑ تک پہنچ جانے والی متحدہ فوج، ایسی قاہر و جابر تھی کہ ان کی تنبیہ کے لئے خود انہی کے سوا اور نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے سوا ہر قوت کو پامال کیا، اور اپنے سوا اور کچھ رہنے نہ دیا، پس کون تھا جو اُن کے مقابلے میں نکلتا، اور دنیا میں کس کا ہاتھ اتنا قوی تھا جو اُن کے آہنی پنجوں پر پڑتا؟ وہ کہ سب سے بڑے ہو گئے تھے، اُن کے لئے وہ لوگ کیا کام دے سکتے تھے، جو آج سب سے چھوٹے ہو گئے ہیں اُن کے جہازوں کے مقابلے کے لئے اُن کے جہازوں سے بڑھ کر جہاز چاہیئے

تھے، مگر وہ کہاں بنتے؟ اُن کی توپوں کے لئے اُن کی توپوں سے زیادہ ہلاکت بار توپیں درکار تھیں؟ مگر وہ کہاں ڈھلتیں؟

پس جب زمین پر اُن سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا جس کے اندر رسنے خدا کا ہاتھ ہوتا تو دیکھو کہ حکمت الٰہی نے کس طرح خود انہی کو مسلط کر دیا، اور اس کی یہ تدبیر کی کہ باہمی جنگ و قتال میں مبتلا ہو گئے اب ان کا ہولناک تمدن جس کو ایک ہزار سال کے اندر انھوں نے تیار کیا تھا، اُنہیں کی تخریب میں کام آیا، اور اُن کی ہر ترقی اور ہر بڑائی خود انہی کے لیئے وسیلۂ تعذیب ہو گئی۔ اگر ان کی توپوں سے بڑھ کر دوسروں کے پاس توپیں نہ تھیں، تو اُنہی کی توپوں کے گولے اُن کے لئے اُڑنے لگے۔ اگر ان سے بڑھ کر جنگی جہاز دوسروں کے پاس نہ تھے تو وہی جہاز اُن کے مقابلے کے لیئے سمندر میں تیرنے لگے۔ ہر پتھر جو انھوں نے اُٹھایا، خود اُنہی کے لیئے اُڑا، اور ہر آلہ جو اُنھوں نے تیار نہیں کیا وہ انہی کے لیئے متحرک ہوا۔ اُنھوں نے بڑا سامان کیا تھا مگر خدا کا سامان سب سے بڑا ہے۔

انهم يكيدون كيدا واكيد كيدا فمهل الكافرين امهلهم رويدا .	یہ لوگ اپنا داؤ کر رہے تھے اور ہم اپنا داؤ کھیل رہے ہیں بس منکروں کو مہلت لینے دو زیادہ نہیں تھوڑی سی۔
۱۲-۵۶	

اسلام اور بیوروکریسی

میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض ہے
اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا چند تنخواہ دار
حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو نوع
انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیئے آیا تھا، یہ آزادی
بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں، اور سوسائٹی کی
طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ
ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود
حق ہے۔ اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا
محکوم اور غلام بنائے، اس نے امتیاز اور بالا دستی کے تمام قومی اور نسلی
مراتب یکقلم مٹا دیئے، اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر
ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیار فضیلت
نہیں ہے، بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام
سب سے اچھے ہوں۔

یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و
قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

(سورۂ حجرات)

اسلام ایک جمہوری نظام ہے

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا، یہ صرف اعلان ہی نہ تھا، بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مشہور مؤرخ گبن کے لفظوں میں "اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا"، پیغمبر اسلام اور اُن کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی، اور صرف قوم کی رائے، نیابت، اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیئے موجود ہیں، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے "پادشاہ" کے اقتدار و شخصیت سے انکار کیا ہے، اور صرف ایک رئیس جمہوریہ (پریسیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اُس کے لیئے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنے نیابت کے ہیں۔ گویا اُس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظام حکومت کے لیئے "شورٰی" کا لفظ استعمال کیا: "وَ امرھم شورٰی بینھم" چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن میں موجود ہے۔ "شورٰی" کے معنی باہم مشورہ کے ہیں، یعنی جو کام کیا جائے، جماعت کے باہم رائے اور مشورہ سے کیا جائے، شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیئے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا قومی وظیفہ

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبے کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے۔ کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے، جس کے الگ کر دینے کے اُس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ (اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی و رحقیقت کے گواہ ہیں ۔) ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ جانتا ہو بیان کرے۔ ٹھیک اُسی طرح (ہر مسلمان کا وظیفہ بھی ڈیوٹی ہے کہ جس سچائی کا اُسے علم و یقین دیا گیا ہے، ہمیشہ اُس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے) علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگریز ہو جاتا ہے کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے اور "دو اور دو"، کو اس لیئے "چار" نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیئے

خطرے میں پڑجائے، اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لئے بدل جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گذرتی ہے؟ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لئے کہ ہمیں قید کر دیا جائیگا آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو جا سکتی!

شہادت علی الناس یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں "شاہد" ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں بحیثیت ایک قوم کے یہی اُن کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے، اور یہی اُن کی قومی خصلت (نیشنل کیریکٹر) ہے جو اُن کو تمام پچھلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا، تم خدا کی زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو۔ پس ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے اِس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

کتمان الشہادت اگر وہ باز رہے، تو یہ قرآن کی اصطلاح میں "کتمان الشہادت" ہے۔ یعنی گواہی کو چھپانا۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے اور بار بار کہا ہے کہ اسی کتمان شہادت کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں

برباد و ہلاک ہو گئیں :۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اسی لئے اسلام کے واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" ہے۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدۂ توحید کے بعد جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان میں سے ایک کام یہ ہے (قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے، وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اس لئے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو روکتے ہیں) اگر وہ ایسا نہ کریں تو اپنی ساری بڑائی کھو دیں۔

(قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے) "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ دنیا کی کوئی لالچ ان پر غالب آ سکتی ہے۔ اور نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی رکھتے ہیں تو صرف خدا سے اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے"

پیغمبر اسلام کے بے شمار قولوں میں سے ایک قول یہ ہے "نیکی کا اعلان کرو۔ برائی کو روکو۔ اگر نہ کرو گے تو ایسا ہو گا کہ نہایت ہی بُرے لوگ تم پر حاکم ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب تمہیں گھیرے گا تم دعائیں مانگو گے کہ یہ حاکم ٹل جائیں۔ مگر قبول نہ ہو گی" (ترمذی و طبرانی عن حذیفہ و عمر رض)

لیکن یہ فرض کیونکر انجام دیا جائے ؟ تو اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین مختلف درجے بتلائے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے فرمایا " تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے تو چاہیئے اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اعلان کرے اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے۔ لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے (مسلم) ہندوستان میں ہمیں یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے گورنمنٹ کی برائیاں دور کر دیں۔ اس لیئے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کیا جس کی استطاعت حاصل ہے یعنی زبان سے اس کا اعلان کرتے ہیں۔

ارکان اربعہ

(قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے اور بتلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہیں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ ایمان۔ عمل صالح۔ توصیۂ حق۔ توصیۂ صبر۔

" توصیۂ حق " کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں اس لیئے حق کے ساتھ صبر کی وصیت بھی ضروری تھی، تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے لیئے ہر حق گو تیار ہو جائے۔

اسلامی توحید اور امر بالمعروف

(اسلام کی بنیادی عقیدہ " توحید " پر ہے اور " توحید " کا ضد " شرک " ہے جس سے

بیزاری اور نفرت ہر مسلمان کی فطرت میں داخل کی گئی ہے) توحید سے مقصد د یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا. دبیں سچائی کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی ایک مسلمان زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھلاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کی سزاوار صرف خدا ہی کی عظمت وجبروت ہے اس کے سوا کوئی نہیں جس سے ڈرنا چاہیئے یا جس کے آگے جھکنا چاہیئے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا، خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا اور اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حقدار ماننا ہے۔ یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

اسی لیئے اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن چابجا کہتا ہے "مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے، ہر حال میں سچی بات کہے" (ولم یخش الا اللّٰہ) پیغمبر اسلام نے فرمایا "سب سے بہتر موت اس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے" (ابوداؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد و قرار لیتے تھے تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا "میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا۔ خواہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں" (بخاری و مسلم)

اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لئے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے

اسلام کے عالموں، پیشواؤں، بزرگوں، مصنفوں کے تراجم تمام تر اسی قربانی کی سرگذشت ہیں۔

(جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں اُن کے لیئے دفعہ ۱۲۴ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہوسکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے!

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کرر ہے ہیں، وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم وجور کے لیئے ہمیں بتلایا گیا تھا، نہ کہ ایک اجنبی قبضۂ وتصرّف کے مقابلے میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے تو انھیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگذر کی حد ہوگئی ہے اس سے زیادہ اسلام کو برطانیہ کے لیئے نہیں چھوڑ سکتے!

اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلے میں دو طرح کے طرزِ عمل کا حکم دیا ہے کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں۔ ایک ظلم اجنبی قبضہ وتسلط کا ہے ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے، پہلے کے لیئے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لئے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے لیکن "امر بالمعروف" اور "اعلان حق"، جس قدر بھی امکان میں ہو، ہر مسلمان کرتا رہے، پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور

سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنا چاہئیں، اور دونوں کا نتیجہ کامیابی و فتح مندی ہے، چنانچہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں، اجنبیوں کے مقابلہ میں سرفروشی بھی کی، اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھلائی، پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی "جنگی جدوجہد" کوئی مثال نہیں رکھتی۔ اسی طرح دوسری صورت میں اُن کی "شہری جدوجہد" بھی عدیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے حالانکہ مقابلہ اُن کا پہلی حالت سے ہے۔ اُن کے لیئے جنگی جدوجہد کا وقت آگیا تھا۔ لیکن انھوں نے "شہری جدوجہد" کو اختیار کیا۔ انھوں نے "نواں وایلنس" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کرلیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہیں کریں گے، یعنی صرف وہی کریں گے جو انھیں مسلمان حکومتوں کے ظلم کے مقابلے میں کرنا چاہیئے۔ بلا شبہہ اس طرزِ عمل میں ہندوستان کی ایک طرح کی حالت کو بھی دخل ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیئے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہوگئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں جو انھیں اپنوں کے مقابلہ میں کرنی تھی

انقلاب حال

میں سچ کہتا ہوں مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کیلئے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے، یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیئے بڑا ہی

بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کیجاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیئے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلایا جائیگا!

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمراں کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمراں کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اُس کا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے، لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی، وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمراں ظالم ہے! یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانہ کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴ الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو!

میں اس دردانگیز اور رجانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلاب حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں انھوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیئے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیئے۔ اُن کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیئے کوئی فتنہ نہیں جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں!

یا آزادی یا موت

لیکن انسانوں کی بدعملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کتاب میں موجود ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں (مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے۔ یا آزاد رہنا چاہیئے) تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

اسی لیئے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جانفروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے، اُن کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بیکار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے

میں متصل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری ۱۸ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہد شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا۔ میں اس کی خاطر چار سال نظر بند رہا مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح و شام اس کی تعلیم و تبلیغ میں صرف ہوتی "رانچی" کے در و دیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں جہاں میں نے نظر بندی کا زمانہ بسر کیا۔ (یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے۔ میں صرف

اسی کام کے لیئے جی سکتا ہوں۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔

آخری اسلامی تحریک

میں اس "جرم" سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں جبکہ ہندوستان کی آخری "اسلامی تحریک" کا داعی ہوں، جس نے مسلمانان ہند کے پولیٹکل مسلک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آرہے ہیں، یعنی اُن میں سے ہر فرد میرے اس جُرم میں شریک ہوگیا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں ایک اُردو جرنل "الہلال" جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا، اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانان ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ (پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے، بلکہ اس کی مخالفت کے لیئے بیورو کریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے گورنمنٹ ہند کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائیگی۔ مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی، اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ ملجانیکی دعوت دی اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت

سوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے پہلے الہلال کی ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظربند کر دیا۔

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" تمام تر آزادی یا موت" کی دعوت تھی اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک بحث و نظر کی بنیاد ڈالی، اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارا کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے ہیں، الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کی نئی اور طاقتور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے پوری طرح فروغ پا لیا۔

میری زندگی سرتاسر ۱۲۴ اے

میں نے گذشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مہاتما گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا، کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں میں نے خلافت، پنجاب، سوراج اور نان کوآپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں! اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں، جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔

دسمبر ۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ آل انڈیا خلافت

کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا۔ اپریل ۲۱ء میں جمعیۃ العلما کا بریلی میں جلسہ ہوا،
گذشتہ اکتوبر میں یو پی پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ میں منعقد ہوئی، نومبر میں
آل انڈیا علماء کانفرنس کا لاہور میں اجلاس ہوا۔ ان تمام کانفرنسوں کا میں بھی
ہی صدر تھا، لیکن ان میں بھی تمام مقررین نے جو کچھ کہا، اور صدارتی
تقریروں میں میں نے جو خیالات ظاہر کیئے، اُن سب میں وہ تمام باتیں
موجود تھیں جو ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔ بلکہ میں اقرار کرتا ہوں
کہ ان سے بہت زیادہ قطعی و واضح خیالات ظاہر کئے گئے تھے!

اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴۔ الف کا جرم ہیں،
تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف پہلی اور پندرھویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں
منتخب کیا گیا ہی؟ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ
فی الواقع اس کا شمار میرے لیئے ناممکن ہو گیا ہے، مجھے کہنا پڑے گا کہ
میں نے گذشتہ سالوں کے اندر اور کوئی کام ہی نہیں کیا!

نواں وایلنس نوان کواپریشن

ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وایلنس نوان کواپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے
تمام جبر و تشدد اور خونریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے، لیکن ہمارا
اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت
پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا

مقابلہ ہتھیار سے نہ کرنا چاہیئے ۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے، میں اسے فطرۃ الٰہی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں، لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لئے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے متفق ہوں، اور ان دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وایلنس جدوجہد کے ذریعہ فتح مند ہوگا اور اس کی فتح مندی اخلاقی وایمانی طاقت کی فتح مندی کی ایک یادگار مثال ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو پاامن جدوجہد کی تلقین کی اور اس کو کامیابی کی سب سے پہلی شرط قرار دیا۔ خود یہ تقریریں بھی اس موضوع پر تھیں جیسا کہ پیش کردہ نقول سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

دعوتِ عمل

آنکھیں دیکھنے کے لئے ہیں۔ کان سننے کے لئے ہیں، اور دل پہلو میں رکھا گیا ہے۔ [illegible] او [illegible] ار رہو، لیکن وہ سب کچھ تمہارے لئے بیکار ہو گیا ہے جس کو آنکھ دیکھتی ہے اور وہ سب آوازیں بے اثر ہو گئی ہیں جو کانوں سے سنائی دیتی ہیں، اور وہ تمام فکریں اور عبرتیں ڈوب گئی ہیں جن سے دل تڑپتے اور روحیں بے قرار ہوتی ہیں پس جو کچھ کیا جائے لاحاصل ہے، اور جو کچھ کہا جائے بیکار رہے۔ آہ! تم غافل ہو گئے ہو تم پر

موت کا پنجہ چل گیا ہے، تم گمراہی کے قبضہ میں آ گئے تمہارے احساس فنا ہو گئے اور تمہارے دل کی دانائی میٹ دی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسا تھا کہ اندھے بینا ہو جاتے، لنگڑے چلنے لگتے، گونگوں کی چیخ سے دنیا ہل جاتی، اور لولوں کے ہاتھ شیروں کے پنجوں کی طرح طاقتور ہو جاتے۔ آہ! تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی، اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے، آہ! تم ایسے نہ تھے،

آہ! میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں، اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اُتر جاؤں، اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں، اور تمہاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو، اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند ہیں، تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو پر نہ تو راستبازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہوں کے نقش قدم کو چھوڑتے ہو۔

پس میں آج سب کچھ چھوڑ کے تم سے ایک ہی آخری بات کہنی چاہتا ہوں اور یقین کرو کہ اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے اگر وہ اس بات کے لئے نہیں کہا جاتا تو سب کچھ بیکار ہے اور اس میں تمہارے لئے کوئی برکت و امن نہیں۔ سو یاد رکھو اور ماننے کے لئے جھک جاؤ کہ تمہاری زندگی کا

ہر عمل بیکار ہے، اور تمہاری فکروں کی ہر فکر گمراہی و ضلالت ہے۔ تمہارے لیئے صرف ایک ہی راہ نجات ہے اور بغیر اس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گذرو گے اس وقت تک خدا کا قہر تم پر سے ٹھنڈا نہ ہوگا۔ اور تم کبھی مراد اور خوشحالی نہ پاؤ گے۔ تمہارے سفر عمل کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو، توبہ کرو، اپنی تمام قوتوں اور تمام طاقتوں کے ساتھ خدا کے آگے جاؤ، اس کے آگے اس طرح گرو اور اس طرح روؤ اور اس قدر تڑپو کہ اسے تم پر پیار آجائے، اور وہ تمہیں پہلے کی طرح پھر اپنی گود میں اٹھالے، اور سب کچھ تمہیں کو دیدے جس طرح کہ سب کچھ تمہیں کو اس نے بخشدیا تھا۔

تم نے غفلت کو خوب آزمالیا، تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑواہٹ چکھ لی، تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر لیئے، تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس طرح ساری دنیا تم سے سرکش ہوگئی اور ایک اس کے روٹھنے سے کس طرح تمام دنیا تم سے روٹھ گئی۔ بس مان جاؤ اور اب بھی باز آجاؤ، گناہوں کو آزما چکے۔ آؤ تقوی اور راستبازی کو بھی آزمالیں سرکشیوں کو چکھ چکے آؤ اطاعت کا بھی مزہ دیکھیں، غیروں سے رشتہ جوڑ کے تجربہ کر چکے آؤ اسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں، ٹھوکروں اور راندگیوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ

نہ آیا۔

اگر تم کو اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے کہ اُسے نہ دو گے اور اپنی جانوں کو اُس کی محبت سے بھی زیادہ پیارا سمجھتے ہو تو اس کے لئے دکھ میں نہ ڈالو گے اور اگر تمہارے دلوں کی آہیں، تمہارے جگر کی ٹیس، اور تمہاری آنکھوں کے آنسو، اب اس کے لئے نہیں رہے ہیں بلکہ دوسروں کا مال ہو گئے ہیں تو یقین کرو کہ وہ بھی تمہارا محتاج نہیں ہے اور اس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے وہ اگر چاہیگا تو اپنے کلمۂ حق کی خدمت کے لیئے درختوں کو چلا دیگا۔ پہاڑوں کو متحرک کر دیگا، کنکروں اور خاک کے ذرّوں کے اندر سے صدائیں اُٹھنے لگیں گی، پر وہ فاسق اور نافرمان انسانوں سے کبھی بھی کام نہ لے گا، اور اپنے پاک کام کی عزت کو ناپاکوں کی گندگی سے کبھی آلود نہ ہونے دیگا۔

(نوٹ) یہ مضامین "الہلال" سے نقل کیئے گئے ہیں۔ جلدی میں ان کی ترتیب قائم نہ رہ سکی، مقدمہ کراچی بھی ادھورا رہ گیا۔

رام گڈھ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے (۵۳ ویں سالانہ اجلاس کا)

خطبۂ صدارت

(از امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد)

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے قوموں کی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت، کوئی بڑی مدت نہیں ہے لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب ہر وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں ہمارا سفر دور کا تھا اور ضروری تھا کہ ہم مختلف منزلوں سے گذرتے ہم ہر منزل میں ٹھہرے۔ مگر رکے کہیں نہیں ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں۔ مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور کاوٹیں کھڑی تھیں ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے۔ نہ چل سکے ہوں۔ لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دیگا۔ ۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی۔ کہ اسکی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن آج نظر اٹھائیے اور سامنے کی طرف دیکھئے۔ نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف

دکھائی دے رہا ہے بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے، ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور، اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے وہاں طرح طرح کی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش ان کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں الجھا دے ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے بھروسہ کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے یہ بہت بڑی عزت ہے اس لئے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزت کے لئے شکر گذار ہوں اور ذمہ داری کے لئے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اَب میں سمجھتا ہوں مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آنا چاہیئے۔

ہمارے لئے وقت کا سب سے پہلا اور اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین الاقوامی ذہنیت اور صورت حال پر ایک

تجویز منظور کرکے اُس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کردیا۔

داور اس کے بعد سے وہ کانگریس کے سالانہ

اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا، جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا۔

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیاہے۔ ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بتاتے ہوئے ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانہ کی بیشمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کردیا ہے۔ اور فکر وعمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کردیتی ہیں، کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں۔ ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا جس نے اس فیصلہ کی شکل اختیار کی۔ ہم نے اِن تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نازیزم کی جو ارتجاعی (Reactionary) ری ایکشنری تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں۔ ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لئے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے اور اس کا دل و دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے جو جمہوریت اور آزادی کی

حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نازی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا تو ہمارے لئے ناممکن تھا۔ کہ ہم اس پرانے خطرے کو بھلا دیتے۔ جوان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لئے مہلک ثابت ہو چکا ہے اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان نئی ارتجاعی قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے اس لئے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کہہ دی کہ اگر یوروپ کی اس نئی کش مکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندوستان جو اپنے آزادارادے اور آزاد پسند سے محروم کر دیا گیا ہے اس میں کوئی حصہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے۔ جبکہ اُسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فیشی ازم سے بیزار ہے مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے اور ہندوستان کسی حالت میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لئے مدد دے

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنوء سے لیکر اگست ۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور رہیں۔

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے۔ کہ اچانک اگست ۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہوگئی۔

اب میں اس واقعہ پر ایک لمحہ کے لئے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا اور درخواست

کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھئے۔ پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے۔

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصہ کے لئے دم لینے کا ارادہ کیا۔ اور اس پر آمادہ ہوگئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرے اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اسکی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی۔ کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورت حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا، جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں۔ اور صورت حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی۔ کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت ر ... ہیں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی ر ... ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت محسوس کریگی کہ اس موقعہ پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے۔ اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برطانوی حکومت کا طرز عمل کیسا رہا ہے۔ تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے اس نے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کر لیا اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجہ تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع نہ دیا گیا ہو۔ لڑائی میں اس کے شامل ہو جانیکا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنیکا موقع دیدیا جائے

جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔ تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرز عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کنیڈا، آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ جنوبی افریقہ آئرلینڈ سب کے لڑائی میں شریک ہونیکا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ولیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر ۔ ۔ ۔ کا سوال قابل اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا۔ وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دیرہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جارہی ہے کہ اُسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں کا درجہ (   ) ملنے والا ہے اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اُسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک ڈھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لئے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھ لیں مگر نہیں، ہمیں جلدی نہیں کرنا چاہئے ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم اسے اور زیادہ نزدیک سے اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے۔ ا

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سلگی تھی۔ اس لئے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا پھر یادش بخیر۔ پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ ۱۴ نکتے دنیا کے سامنے آئے اور ان کا جو کچھ حشر ہوا۔ دنیا کو معلوم ہے اس مرتبہ صورت

حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِ فعل (شروع) ہو جائے۔ وہ شروع ہوا اس نے اٹلی میں فیشسزم اور جرمنی میں نا تسیزم کا روپ اختیار کیا اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت (دُنیا کے) امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صُورتِ حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آکھڑی ہوئیں، ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی۔ دوسری ارتجاعی قوتوں کو آگے بڑھانے والی اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لئے فیشسٹ اٹلی اور نا تسی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی ناقابلِ برداشت تھی، اور جو اسے برطانی سامراج کے لئے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی۔ تین برس تک اس منظر کا تماشہ دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نا تسی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سینا۔ اسپین۔ آسٹریلیا۔ چیکوسلاواکیہ اور البانیہ کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنے انتہائی شکل میں ابھر آیا۔ اور نا تسی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہو گئی۔ اُسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اترتی تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ اب چھوٹی قوتوں کی آزادی کے پُرانے نعرے کی جگہ جمہوریت، آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی۔ اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ ۳ ستمبر کا اعلانِ جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی اُن تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بد امنی کے عذاب سے) حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دئے۔

کانگریس کا مطالبہ

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۸ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی تاکہ صورت حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگریس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے، جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلان جنگ کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا تھا وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا یقینا اسے ملامت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی جو صورت حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے اپنے کانوں کو بند کر لیا اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اٹھایا جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ اس صورت حال میں اس کے لئے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دئے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھدے جس پر نہ صرف ہندوستان کا۔ بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونیکی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہئے، کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (   ) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے۔ اور یہ واقعی اس لئے لڑی جا رہی ہے۔ کہ آزادی، جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم (   ) سے دنیا کو آشنا کیا جائے۔ تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبہ کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے۔ خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا۔؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا اور ۱۴ ستمبر

سنہ ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لئے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا۔ تو مجھے یقین ہے کہ میں آنیوالے مورخ سے کوئی بیجا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت کا ایک سادہ مگر ناقابل رد نوشتہ ہے جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ چکی ہیں مبتلا کی گئی۔ اور صرف اس لئے مبتلا کی گئی تاکہ اسکے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ، ہتھیاروں کی حد بندی، بین الاقوامی پنچائیت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں لگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی۔ ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا رہا ہے، کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہونا چاہیئے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگریس کا پہلا قدم

کانگریس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے اس سلسلہ کے لئے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے، جو ۱۷-اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند کے سرکاری علم ادب کے الجھے ہوئے انداز، اور رتھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل

نمونہ ہے ۔صفحے کے صفحے پڑھ جانیکے بعد بھی ،اس قدر بتانے پر مشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لئے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیئے ۔جو صرف یوروپ کے امن اور بین القوامی رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے ۔جہاں تک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے ۔وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے ۔اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی ۔

۱۷۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا ۔اور ۲۲ر اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنیکے لئے واردھا میں بیٹھی ۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہونچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اُسے مطمئن نہیں کر سکتا ۔اور اب اُسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیئے ۔جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا جو فیصلہ کمیٹی نے کیا ۔وہ اسکی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے ۔

> "ان حالات میں کمیٹی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کرلے ۔کمیٹی کانگریس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے ،اسکی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں ۔

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفے ادے دیا ۔یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی ۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرکے کہاں تک پہونچتا ہے ؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونک جو ۹ ر فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے ۔جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انہوں نے ۶ ر فروری کو شائع کیا اس کی آخری کڑی سمجھی جا سکتی ہے اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے ۔برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے

ممکن ہو برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کرے۔ اور درمیانی زمانہ کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لئے خود اختیاری فیصلے کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس یا لیے ہیں جو کچھ کہتی رہی ہیں وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اٹھایا حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ لڑائی کا مقصد ہے مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا، ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرات نہیں کرنی چاہیے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ر فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا انہوں نے ہمارے لئے برطانوی حکومت کے صاف طرز عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہونچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں "ہماری لڑائی اس لئے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کر لیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی"!!

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقعہ پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانوی نہیں ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے اٹھارویں اور انیسویں

صدی میں انسان کے انفرادی و اجتماعی آزادی کے جس قدر اصول قبول کئے گئے ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لئے خاص سمجھا گیا۔ اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرلے سے کبھی باہر نہ جا سکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ جنھیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے۔ کہ کم از کم ایک انسان اب بھی بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ وہ انسانی حقوق کے لئے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلان جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے؟ اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو اس بات سے ہم بے خبر نہ تھے۔ کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ۱۸۷۰ء اور ۱۹۱۸ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ۱۹۳۹ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے ہمیں یقین دلایا جاتا ہے۔ کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہشمند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو نوآبادیات کا درجہ حاصل کرے ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ اس کی بہت زیادہ خواہشمند ہے مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں

کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دیگا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی؟

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لئے صورت حال بالکل واضح ہو گئی ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لئے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جا رہی ہے

ہم آج کہاں کھڑے ہیں

اب ہم اُس جگہ پر واپس آجائیں جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس کا رُخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف اُبھر آیا ہوگا۔ کہ اَب اُسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں۔ میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون کا جو قدم ۱۹۳۷ء میں اُٹھایا تھا۔ ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لئے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترک تعاون کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اُٹھا یا جائے تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے

ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یہ یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں۔ جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جب ہی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے۔ جبکہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں۔ مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہہ و بالا کر دئے اور انصاف اور معقولیت کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لئے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ اُبھار رہی ہے وہاں امید کا ایک دوسرا رُخ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بیشمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے۔ جو نہایت تیزی کے ساتھ طرف اُبھر رہی ہے یہ دُنیا کے پرانے نظم کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے اور معقولیت انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لئے بے قرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر ابھر رہی ہے اور ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں

جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا۔ آئندہ کے لئے معقولیت انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لئے تیار ہو جائیں عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جائیں معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی۔ اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے۔ مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے۔

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو ہماتماجی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جوان پر کھولا جاتا ہے بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں بلا تامل قدم رکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ برطانوی کابینہ کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا، اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے۔ جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن و انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے۔ جس طرح لڑائی سے پہلے تھا ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعوؤں کے لئے ایک حقیقی کسوٹی تھی دعوے کسوٹی پر کسے گئے اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں جو

جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھہ دیا۔ گذشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی۔ کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جائیگا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں۔ جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جاسکتیں۔ جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دُور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے مخالفت کرنے کی جرأت کر سکے وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے خواہش مند نہ ہوں۔ وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضے سے بے بس ہو رہی ہیں۔ اور انھیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورت حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اُٹھا دئے۔ وہاں اس گوشہ کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ، دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کے فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کرکے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے۔ بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی۔ کہ ہندوستان کے مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ خارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر اُن ...... صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کام میں لائے تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تہا۔ اور ہمارے لئے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اُس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہوسکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہوچکا۔ یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی۔ اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم ازکم اس گوشے میں وہ اپنے طرز عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اس نے ثابت کردیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جارہا ہے۔ کہ ختم ہوگیا اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہرحال اب آپ خواہ کچھ ہی کہہ رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے۔ اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیئے۔ کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ کر اٹھے گا۔ یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی اعتراضات کے معنی صرف یہی ہونے چاہیئیں کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہیئیں کہ اُسے

ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے۔ تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے وہ یہی گوشہ ہے۔

گانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لئے جو جگہ بنائی ہو وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اول دن سے دعویٰ رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے۔ ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے۔ کہ کانگریس نے یہ دعویٰ کرکے دنیا کو اس بات کا حق دیدیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اسکے طرز عمل کا جائزہ لے، میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھکر ہم آج کانگریس کے طرز عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی، اس کی اہمیت، اس کے فیصلہ کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اُسنے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی اُس نے اُس کے فیصلہ کے لئے وہی طریقہ تسلیم کیا۔ جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارہ میں کوئی نہیں بتلایا جا سکتا۔ اور اگر بتلایا جا سکتا ہے، تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے۔ اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ سے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لئے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابل انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔ کانگریس نے ہمیشہ اس بارہ میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی

قدم اٹھایا یا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا۔

(۱) ہندوستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آیندہ بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے۔

(۲) اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لئے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لئے جج خود اقلیتیں ہیں، نہ کہ اکثریتیں۔ اس لئے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔ نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصّہ میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں ..... میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرز عمل اس بارے میں اختیار کیا جاسکتا ہے اگر کیا جاسکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرز عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے ادار فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس ۱۹ برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصہ میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس ۱۹ برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گذرا جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقے سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا۔ اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرز عمل بھی تھا۔ پچھلے پندرہ ۱۵ برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لئے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں۔ مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اسے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا

جس طرح اعتراف کیا ہے۔ وہ اس کے لئے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چنکر بھیجیں۔ ان کے نمایندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رائوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی۔ خود اقلیتوں کی رضامند (ی) ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی بیش بندی ہے ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اُسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل کے لئے یہ اصول سامنے رکھ لئے ہیں اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ انپر قائم رہے تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں۔ کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقعہ نہیں دیدیتی۔ کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے تصفیہ کر لیں۔

ہم میں تفرقے پیدا کئے گئے۔ اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہئیں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے یہ بندھن ہیں

ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے۔ اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لاسکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں۔ جو آج سے ۲۸ برس پہلے میں الہلال کے صفحوں میں لکھتا رہا ہوں اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں میں نے اس زمانہ میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس سے یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کیطرف اندیشہ ناک رہنا چاہیئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھولدیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں اسنے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی

اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اسلئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ کو معلوم کرنی چاہیئے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی (اب یونائیٹڈ آؤنسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیئے

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، انمیں سے ایک بیج یہ تھا۔ اسنے فوراً پھول پتے پیدا کئے۔ اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو۔ لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کیطرف سے مضطرب ہونا چاہیئے بلکہ اُسے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے، جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑی اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کیلئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے

گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جاسکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Numbers) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے فرض کیجئے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسری کی دو کروڑ ہے اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا۔ مگر سیاسی نقطہ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کرکے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کرلیں اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کی نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہیں۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے۔ کہ آپکے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اسکی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یکجہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد محفوظ رکھا ہے۔ بلا شبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے۔ خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی

اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی constitution اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے، وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق Federation کا جمہوری دستور ہوگا جس کے کل حلقے Units اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات وفاع Defence کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دفاع جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے لا سکتا ہے۔ ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لئے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل نقشے میں ان اندیشوں کے لئے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے۔ ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں، مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود نا چاہیئے، جوں ہی ہم نے ایسا کیا۔ ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

مسلمانانِ ہند کیلئے ایک بنیادی سوال

تقریباً ۳۰ برس ہوئے جب میں نے بہ حیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے

اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی۔ اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگرس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کرلی گئی تھی۔ وقت کی یہ عام آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا۔ اور اسنے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھولدی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اسکی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کے معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب میں موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہوجاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان نہیں آیندہ کا کوئی وعدہ دستوراساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہوسکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے۔ اور اپنی جگہ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں۔ اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لئے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیئے پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہوجاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک تذبذب، بے عملی، اور انتظار کی درماندگیوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا وقت کا کوئی الجھاؤ۔ حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں

کارخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے ہوئے جائیں۔

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لئے ممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کرسکوں، میں کسی مسلمان کے لئے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈھکر نکال نہ پھینکی ہو۔ یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا۔ اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپکو یہ یاد دلانیکی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں، ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانان ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظر بندی کے بعد رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گذر چکے، اس عرصہ میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لئے تیار نہیں۔

ہاں وہ اب پیچھے لوٹنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کرونگا میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاتاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا۔ آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ ان میں کوئی حالت ایسی حالت نہیں جو میرے سامنے سے نہ گذری ہو میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک